فہرست

شذرات	قومی تعمیر میں مذہبی قیادت کا کردار	منظور الحسن	۲
	ریفرنڈم	〃	۶
قرآنیات	البقرہ (۲: ۱۹۵-۱۹۶)	جاوید احمد غامدی	۱۱
معارفِ نبوی	بھرے ہوئے ہاتھ	طالب محسن	۱۵
دین و دانش	قانون معاشرت (۸)	جاوید احمد غامدی	۱۹
نقطۂ نظر	تفسیر کبیر کا تعارف	محمد عمار خان ناصر	۲۳
یسئلون	متفرق سوالات	محمد بلال	۳۵
	حیا اور حجاب	جاوید احمد غامدی / وقار ملک	۴۳
	خواب	〃	۴۸
	ہندو مسلم فسادات	〃	۵۳
حالات و وقائع	ہاشمیہ سے اسلام آباد تک	خورشید احمد ندیم	۵۷
	کیا فلسطین کو بچایا جا سکتا ہے؟	〃	۶۰
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	محمد اسلم نجمی	۶۳
	نماز میں خشوع و خضوع	کاشف علی خان شیروانی	۶۸
	جنت	معاذ احسن غامدی	۶۹
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۷۱

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قومی تعمیر میں مذہبی قیادت کا کردار

عرفان الٰہی کی وہ میراث جو ابراہیم و موسیٰ اور مسیح و محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام نے چھوڑی ہے، وہ علما کا سرمایۂ حیات ہے۔ چنانچہ انبیا کی نیابت میں اب یہ انھی کا منصب ہے کہ اپنے ہم قوموں کو جہنم کے عذاب سے خبردار کریں اور جنت کے انعام کی خوش خبری سنائیں؛ یہ انھی کا کام ہے کہ علوم دینیہ پر غور کریں اور ان کی روشنی میں زمانے کے لیے لائحۂ عمل تشکیل دیں؛ یہ انھی کا فریضہ ہے کہ دینی تعلیم کو ہر آمیزش سے پاک کریں اور اسے دنیا کے قریے قریے تک پہنچائیں؛ اور یہ انھی کی ذمہ داری ہے کہ عامۂ امت کو انداز زندگی سکھائیں اور ان کی تعمیر و ترقی کے لیے صحیح راستوں کا تعین کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ علماے امت نے ان فرائض منصبی کو نہایت خوبی سے نبھایا ہے۔ یہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے، انھوں نے جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانی ہے، گھر بار چھوڑے ہیں، نعمتوں سے صرف نظر کیا ہے، تازیانے کھائے ہیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور بسا اوقات اپنی جانیں بھی راہ حق میں پیش کر دی ہیں۔ بخاری و مسلم، مالک و احمد، بوحنیفہ و شافعی، غزالی و ابن تیمیہ نے دین و ملت کی جو خدمت کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اس طائفۂ علما کے سرخیل تھے۔ ان کے پیرووں نے عزم و استقامت اور حکمت و دانش کے ساتھ اقوام امت کی رہنمائی کی اور انھیں مدت تک جسد واحد میں پروئے رکھا۔ انھوں نے ارباب اقتدار کو ان کے فرائض سے منحرف نہیں ہونے دیا۔ عامۃ الناس کے اخلاق و کردار کو مجروح ہونے سے بچایا اور انھیں خوابوں میں جینے کے بجائے حقیقت پسندی کا درس دیا۔ اس رہنمائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اخلاق و کردار، عدل و انصاف، علم و ہنر اور نظم و ترتیب میں اوج کمال پر فائز ہوئے اور اسی بنا پر صدیوں تک عالم کی مسند اقتدار پر فائز رہے۔

امت جب زوال پزیر ہوئی تو جہاں وہ حکمران رخصت ہوئے جن کے عدل اجتماعی کو امتیں تسلیم کرتی تھیں، وہ سالار رخصت ہوئے جن کی ہیبت سے ظالم قومیں کانپ جاتی تھیں، وہ صناع رخصت ہوئے جنھوں نے اشہب تمدن کو مہمیز کر دیا تھا، وہ مدبر رخصت ہوئے جن کی دانش نے عمرانی علوم کے نئے دریچے کھول دیے تھے، وہ حکما رخصت ہوئے جن کے افکار نے اسرار حیات کو آشکارا کر دیا تھا، وہاں وہ داعیان دین حق، وہ معلمین کتاب و سنت اور وہ قائدین ملت اسلامیہ بھی رخصت ہو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

گئے جوان سب کے لیے قوت محرکہ کا کردار ادا کر رہے تھے اور جن کے وجود سے ان سب کا وجود قائم تھا۔ یہ علما دنیا سے اٹھے اور اس طرح اٹھے کہ امت کا وجود روح اسلام سے خالی ہو گیا اور طاغوت کے تن مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی:

جہاں سے اس طرح اٹھے یہ اہل مے خانہ
کہ بحر و بر میں عزازیل نے جلائے چراغ
فلک کا نوحہ زمیں کے حدود میں پہنچا
کہ کھو دیا ہے ستاروں نے منزلوں کا سراغ

جو لوگ ان کے جانشین ہوئے انھوں نے علم و تحقیق اور اخلاق و تقویٰ کا بہرہ تو وافر جمع کر لیا، مگر قومی و اجتماعی امور میں امت کی صحیح رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے سے قاصر رہے۔ اس ضمن میں انھوں نے امت کو جو درس دیا، واقعہ یہ ہے کہ وہ امت کی تعمیر و ترقی کے بجائے شکست و ریخت ہی کا باعث ہوا۔ اس موقع پر زمانہ ان سے یہ توقع کر رہا تھا کہ وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھیں گے، حکمت و دانش کو بروئے کار لائیں گے، اسباب زوال کو متعین کر کے ان کے تدارک کی حکمت عملی ترتیب دیں گے اور پھر امت کو پوری ثابت قدمی کے ساتھ صحیح خطوط پر آگے بڑھائیں گے۔ مگر نہ زمانے کی نبض کو ٹٹولا گیا، نہ حکمت و دانش کو آزمایا گیا، نہ اسباب زوال کی تحقیق کی گئی اور نہ قومی ترقی کے لیے لائحۂ عمل مرتب کیا گیا۔ اس کے برعکس اس جماعت علما کی کارگزاری کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے کچھ زوال کی نوحہ خوانی سے قوم پر مایوسی طاری کر کے خاموش ہو گئے، کچھ کنارہ کش ہو کر خانقاہوں میں کھو گئے، مگر بیشتر نے امت میں آتش جذبات کو انگیخت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہی جذبات پرور علما اس دور زوال میں امت کی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے اور آج تک یہ منصب انھی کے پاس ہے۔

گزشتہ دو تین صدیوں میں انھوں نے مسلمانوں کو جو رہنمائی فراہم کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

انھوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ انھیں معاملات دنیا کو چشم خرد سے نہیں، بلکہ نگاہ جذبات سے دیکھنا چاہیے۔ ان پر اگر زوال آیا ہے تو اس کے اسباب ان کے اپنے ہاں جو ہیں سو ہیں، مگر اس کا بڑا سبب ان کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ دشمن اقوام کا قلع قمع کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر اٹھ کھڑے ہوں اور اس وقت تک برسر پیکار رہیں، جب تک وہ ان کی سیادت تسلیم نہیں کر لیتیں یا صفحۂ ہستی سے محو نہیں ہو جاتیں۔ اس جدوجہد میں اگر وہ خود دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو انھیں جان رکھنا چاہیے کہ محکومی کی زندگی سے شہادت کی موت بدرجہا بہتر ہے۔

یہ طرز عمل سکھایا ہے کہ کمزور کو طاقت ور کے جواب میں حکمت سے نہیں، بلکہ شدید ردعمل سے کام لینا چاہیے۔ حکمت سراسر بزدلی کی علامت ہے۔ اگر وہ ظلم سہتے جائیں گے تو اس کا سلسلہ دراز ہوتا جائے گا۔

یہ تعلیم دی ہے کہ انھیں اسباب و وسائل کی فکر نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اللہ کی نصرت پر بھروسا کر کے اپنے حقوق کے لیے

برسرِ جنگ ہو جانا چاہیے۔ اگر ان کا ایمان سلامت ہے تو پروردگار عالم لازماً اپنے فرشتوں سے ان کی مدد فرمائیں گے۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہو گا، اللہ تعالیٰ نے کئی مرتبہ پہلے بھی مختلف میدان ہائے کارزار میں ہزاروں اور لاکھوں کے مقابلے میں سیکڑوں مسلمانوں کو فتح عظیم سے ہم کنار کیا ہے۔

یہ سمجھایا ہے کہ ان کی بقا کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ جہاں وہ مقیم ہوں، وہاں ان کے پاس لازماً سیاسی اقتدار ہونا چاہیے۔ وہ اقلیت میں ہوں تب بھی انھیں اس کے حصول کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر پرامن طریقے سے یہ جدوجہد بار آور نہ ہو سکے تو پرتشدد ہو کر اسے جاری رکھنا چاہیے۔

یہ باور کرایا ہے کہ دنیا پر حکمرانی نہ صرف ان کا استحقاق ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے۔ ہر مسلمان کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی استعداد کے لحاظ سے اس فرض کو بجا لائے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک مسلمان کا مقصد حیات ہی دنیا پر اسلام کی حکومت کا قیام ہونا چاہیے۔

یہ بتایا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک دنیا کی سب سے مکرم قوم ہیں۔ اس لیے کہ وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں اور ان کی زبان پر کلمۂ طیبہ جاری ہے۔ اس بنا پر آخرت میں تو انھیں سرخ رو ہونا ہی ہے، لیکن دنیا میں بھی وہ لائق فضیلت ہیں۔ چنانچہ اگر کسی وقت وہ اخلاقی اعتبار سے نہایت پست بھی ہو جائیں، تب بھی تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔

یہ واضح کیا ہے کہ ان کی سیادت کی کلید جہاد و قتال ہے۔ جب تک وہ اس میدان میں سرگرم تھے تو دنیا پر غالب تھے اور جب سے انھوں نے اس میدان کو چھوڑا ہے، محکومی ان کا مقدر بن گئی ہے۔ چنانچہ اگر وہ اپنی عظمت رفتہ کو واپس لانا چاہتے تو انھیں جہاد و قتال کے لیے مستعد ہونا ہو گا۔

اس تعلیم و تربیت کا خلاصہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک ہی درس ہے جو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے علما کی زبانوں پر جاری ہے کہ مسلمانو، تلوار اٹھاؤ اور دنیا سے برسرِ پیکار ہو جاؤ، یہاں تک کہ دنیا کی مسند اقتدار پر قابض ہو جاؤ یا آخرت کے مرتبۂ شہادت پر فائز ہو جاؤ۔

علما کی اس رہنمائی کو اگر تاریخ کے اوراق میں دیکھا جائے تو چند مثالیں بہت نمایاں ہیں۔

سید احمد شہید (۱۷۸۶۔۱۸۳۱) ہیں جنھوں نے ہند میں سکھوں کی حکومت کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے تحریک شروع کی۔ جہاد کے نام پر چند سو سرفروشوں کو جمع کر کے سکھوں کی طاقت ور حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ابتدا میں کچھ علاقے پر قبضہ بھی کر لیا، مگر بالآخر بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں کی بیس ہزار فوج سے مقابلے میں اپنے تمام سرفروش ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔

امام شامل (۱۷۹۷۔۱۸۷۱) ہیں جن کی قیادت میں داغستان کے مسلمانوں نے روسی استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی۔ یہ جنگ کم و بیش پچیس سال تک جاری رہی۔ جہاد اور آزادی کے نام پر ہزاروں مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان

کیں، مگر آخرکار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

مہدی سوڈانی (۱۸۴۴۔۱۸۸۵) ہیں جو سوڈان کو مصر سے آزاد کرا کے انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ اسی دوران میں ۱۸۸۵ میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے جانشین زیادہ عرصہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۸۹۹ میں انگریز سوڈان پر قابض ہو گئے۔ انگریز سالار نے جذبۂ انتقام کے تحت سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہدی سوڈانی کی قبر اکھاڑ دی اور ان کی ہڈیاں تک جلا ڈالیں۔

مفتی اعظم امین الحسینی (۱۸۹۳۔۱۹۷۴) ہیں جنھوں نے فلسطین کی آزادی کے لیے انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ انگریزوں نے انھیں فلسطین سے جلا وطن کر دیا۔ انھوں نے آخری دم تک فلسطین کی آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھی جو بارآور نہ ہو سکی۔

حسن البنا (۱۹۰۶۔۱۹۴۹) ہیں جنھوں نے مصر میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کے لیے ''اخوان المسلمون'' کے نام سے تنظیم قائم کی اور رضا کار بھرتی کیے۔ اخوان کے رضا کاروں نے فلسطین کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ برطانیہ کے دباؤ پر مصری حکومت نے ''اخوان المسلمون'' پر پابندی عائد کر دی، ہزاروں کارکنوں کو قید کر لیا۔ اسی ہنگامے میں حسن البنا کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب شہید (۱۹۰۶۔۱۹۶۶) ہیں جو مصر میں ''اخوان المسلمون'' ہی کے بڑے رہنماؤں میں سے تھے۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے ۱۵ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اس دوران میں صدر جمال عبدالناصر نے انھیں وزارت تعلیم کی پیش کش کی، مگر سید قطب نے انکار کر دیا۔ ۱۹۶۶ میں انھیں حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔

محمد بن عبدالکریم ریفی (۱۸۸۲۔۱۹۶۳) ہیں جنھوں نے شمالی مراکش پر مسلط اسپین کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اسپین کی حکومت نے بغاوت فرو کرنے کے لیے انیس ہزار فوج بھیجی۔ عبدالکریم نے اسے زبردست شکست دے کر شمالی مراکش کو آزاد کرا لیا اور وہاں جمہوریہ ریف کے نام سے نئی حکومت قائم کی۔ اس سے فرانس کو خطرہ ہوا جو مراکش کے باقی حصے پر قابض تھا۔ اس نے اسپین سے مل کر تقریباً تین لاکھ افواج پر مشتمل لشکر تیار کیا اور بہت مختصر مدت میں ریاست ریف پر قبضہ کر کے عبدالکریم کو ۲۱ سال کے لیے قید کر دیا۔

ملا عمر ہیں جنھوں نے افغانستان کے حالیہ زمانۂ طوائف الملوکی میں طالبان کے ذریعے سے بزور حکومت حاصل کی۔ امریکی سپر پاور کے مطلوبہ افراد کو پناہ دے کر پورے دینی جذبے کے ساتھ امریکہ سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ وہ حکومت سے محروم ہوئے، ہزاروں صالح مسلمان جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بموں کی تاخت سے افغانستان کھنڈر بن کر رہ گیا۔

یہی وہ خطوط ہیں جن پر جمال الدین افغانی، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، علامہ اقبال، ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آیت اللہ خمینی، امیر شکیب ارسلان، مصطفی حسن سباعی، رشید رضا مصری اور ڈاکٹر حسن ترابی رحمھم اللہ جیسے جلیل القدر علما نے مسلمانوں کی تربیت کی۔ یہ سب لوگ دین کے علم بردار تھے، اسلام سے بے پناہ محبت رکھتے تھے، نیک نیت اور پاکیزہ صفت تھے اور دین وملت کے بعض دوسرے پہلوؤں میں لافانی خدمات کے کارگزار تھے، مگر اس سب کچھ کے باوجود قومی معاملات میں غلط رہنمائی کی وجہ سے امت کے وجود اجتماعی کے لیے ضرر رسانی کا باعث ہوئے۔

یہ رجال کار اگر جذباتی ہیجان اور مثالیت پسندی سے بالاتر رہتے اور حقیقت کی زمین پر کھڑے ہو کر امت کو درپیش مسائل کا جائزہ لیتے تو ان کا طرز عمل یقیناً مختلف ہوتا۔ کاش! وہ اس موقع پر مسلمانوں کو قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس غیر متبدل قانون سے روشناس کراتے کہ:

''اللہ اس انعام کو جو کسی قوم پر کرتا ہے، اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اس چیز کو نہ بدل ڈالے جس کا تعلق خود اس سے ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' (الانفال ۸: ۵۳)

''اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کر لے۔ اور جب اللہ کسی قوم پر آفت لانے کا ارادہ کر لے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور ان کا اس کے مقابلے میں کوئی بھی مددگار نہیں بن سکتا۔'' (الرعد ۱۳: ۱۱)

گویا قوموں کے عروج وزوال اور انعام وعقوبت کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس کا انعام قوم کے کردار اور صفات پر مبنی ہوتا ہے۔ جب تک کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے مقررہ کردار کی حامل اور مطلوبہ صفات سے متصف رہتی ہے تو وہ انعامات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، بصورت دیگر وہ اس کے لیے زوال اور بربادی مقدر کر دیتے ہیں۔

منظور الحسن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریفرنڈم

صدر پاکستان جناب پرویز مشرف صاحب کے بارے میں یہ تین باتیں قومی سطح پر تسلیم کی جا چکی ہیں: ایک یہ کہ ملک و قوم کے بارے میں ان کے جذبات خیر خواہانہ ہیں، دوسرے یہ کہ بہتر انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور تیسرے یہ کہ نازک حالات میں صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان حقائق کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ ان کی سیاسی حیثیت تا حال محل

بحث ونظر ہے۔ انھیں خود بھی اس مسئلے کا ادراک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے سیاسی استحکام کے لیے گزشتہ ڈھائی برسوں میں کئی اقدامات کیے ہیں۔ ریفرنڈم بھی اسی نوعیت کا اقدام ہے۔ اس کے ذریعے سے انھوں نے اپنی حکومت کے لیے میں عوام کی تائید حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے کے حوالے سے عام لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے سوال موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا ریفرنڈم کا عمل شفاف ہوگا؟ اگر شفاف ہوگا تو کیا وہ عوام بھی رائے دہی کے لیے نکلیں گے جوان کی حکومت کو ناجائز تصور کرتے ہیں؟ کیا وہ سابقہ ریفرنڈم کے تجربے کی بنا پر اسے ایک جعلی اقدام قرار دے کر گھروں میں نہیں بیٹھے رہیں گے؟ ان سوالوں کے واضح جواب زبان حال سے معلوم ہو جائیں گے۔ اس لیے یہاں ہم ان سے تعرض کیے بغیر اس اقدام کے بارے میں محض اصولی نکات بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کسی قومی واجتماعی اقدام کے بارے میں اصولی رائے قائم کرتے ہوئے اسے تین پہلوؤں سے ضرور دیکھنا چاہیے:

اول یہ کہ کیا اقدام قانونی لحاظ سے درست ہے؟

دوم یہ کہ کیا اس پر کوئی اخلاقی اعتراض تو نہیں ہوتا؟

سوم یہ کہ دین اس کے بارے میں کیا رہنمائی دیتا ہے؟

مذکورہ اقدام کو اگر قانونی لحاظ سے دیکھا جائے تو اسے درست قرار دینا محال ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آئین میں ریفرنڈم کی پوری گنجایش موجود ہے، مگر اس کی روح یہ ہرگز نہیں ہے کہ انتخابات کی ضرورت بھی اسی طریقے سے پوری کی جائے۔ اس ضمن میں آئین کے الفاظ یہ ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

> ''اگر صدر کسی بھی وقت، اپنی صوابدید پر یا وزیراعظم کے مشورے پر یہ سمجھے کہ یہ مناسب ہے کہ قومی اہمیت کے کسی معاملے کو ریفرنڈم کے حوالے کیا جائے تو صدر اس معاملے کو ایک ایسے سوال کی شکل میں جس کا جواب یا تو ''ہاں'' یا ''نہیں'' میں دیا جا سکتا ہو، ریفرنڈم کے حوالے کرنے کا حکم دے گا۔''

اس شق پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد اصلی حکومت کے انعقاد یا استحکام کے بارے میں رائے لینا نہیں ہے، بلکہ کسی قومی اہمیت کے معاملے میں عوام کا نقطۂ نظر معلوم کرنا ہے۔ مثال کے طور پر افغان امریکا جنگ کے موقع پر حکومت اس سوال پر ریفرنڈم کرا سکتی تھی کہ کیا پاکستان کو امریکا کی حمایت کرنی چاہیے؟ لیکن جہاں تک کسی فرد کی حکومت کے قیام یا استحکام کا تعلق ہے تو اس مقصد کے لیے آئین میں انتخابات کا متعین اور واضح طریق کار موجود ہے۔

مزید برآں اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ آئین کے درج بالا الفاظ ریفرنڈم کے ذریعے سے حکومت کی تائید و توثیق کے حصول کو نہیں روکتے، تب بھی یہ سوال بہرحال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنرل مشرف صاحب اس اختیار کے استعمال کا حق رکھتے ہیں؟ اس گنجایش کو کسی ایسے فرد کے لیے تو مانا جا سکتا ہے جو آئینی طریقے سے مناصب حکومت پر فائز ہوا ہو، مگر ایسے شخص

کے لیے جس نے بزور آئینی حکومت ختم کر کے اپنا اقتدار قائم کیا ہو، یہ استحقاق درست معلوم نہیں ہوتا۔

اخلاقی لحاظ سے بھی اس اقدام پر بعض اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ''طریق انتخاب'' ایک قسم کا دھوکا ہے، کیونکہ اس میں عوام کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی قومی مسئلے کو حل کر رہے ہیں یا اپنے سربراہ حکومت کا تقرر کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے نہ متبادل شخصیت ہوتی ہے، نہ متبادل جماعت ہوتی ہے اور نہ متبادل منشور۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر ان کا جمہوری ذہن روبہ عمل ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اس موقع پر عوام کے سامنے یہ صورت رکھی ہی نہیں گئی کہ اگر ان کی اکثریت عدم اعتماد کا اظہار کرتی ہے تو کیا جنرل صاحب خود کو اقتدار سے الگ کر لیں گے؟ تیسرے یہ کہ سرکاری میڈیا کے ذریعے سے جنرل صاحب کی تائید کے لیے جو ''انتخابی مہم'' چلائی جا رہی ہے، وہ عدل وانصاف کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔

دینی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اقدام 'امرھم شوریٰ بینھم' کے قرآنی اصول کے منافی ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظام ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہوتا ہے۔ گویا مسلمانوں کا جب بھی کوئی اجتماعی نظام قائم ہوگا، اس میں اساسی اصول کی حیثیت اسی قاعدے کو حاصل ہوگی۔ چنانچہ اس کی رو سے ریاست کی سطح پر ہونے والا فیصلہ مسلمانوں کے مشورے ہی سے ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں ان کے فیصلے کو حتمی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ اس بنا پر جنرل صاحب کا یہ اقدام بھی ان کے سابقہ سیاسی اقدامات کی طرح درست نہیں ہے۔ انھیں اگر ریفرنڈم کرانا ہی تھا تو اس سوال پر کراتے کہ کیا عوام ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ سے پہلے کی سیاسی صورت حال میں واپس جانا چاہتے ہیں یا آئین کے مطابق نئے انتخابات کرانے کے خواہش مند ہیں؟ اس ملک کے عامۃ المسلمین کے باضابطہ نمائندوں نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنے نظم سیاسی کو چلانے کا ایک طریقہ وضع کیا تھا جسے ہم ۱۹۷۳ کے آئین سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بات بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پوری قوم بالاتفاق اسی طرز سیاست کی حامی ہے۔ یہ بات اگر صحیح ہے تو کسی فرد یا گروہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عوام کی رائے کے علی الرغم کوئی طرز سیاست وضع کرنے کی کوشش کرے۔ اگر عوام کے تشکیل کردہ نظام میں خامیاں موجود ہیں تو ان کی اصلاح کی ذمہ داری بھی عوام ہی کے پاس ہونی چاہیے۔ قرآن مجید کی اس صریح نص کا یہی تقاضا ہے۔

ان نکات کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ریفرنڈم کا اقدام قانونی، اخلاقی اور دینی لحاظ سے درست نہیں ہے۔

یہاں حرف آخر کے طور پر اس استدلال کا جائزہ بھی مناسب ہوگا جو ریفرنڈم کے حق میں عام طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ استدلال یہ ہے کہ اگر جنرل مشرف صاحب سیاسی منظر سے ہٹتے ہیں تو وہی بدعنوان سیاست دان قوم پر پھر مسلط ہو جائیں گے جنھوں نے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے سیاست دانوں کے دامن میں قوم وملک کی خیرخواہی کا اثاثہ نہ ہونے کے برابر ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا گزشتہ پچاس سالوں میں بدعنوانی اور غیر ذمہ داری

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کا مظاہرہ صرف سیاست دانوں ہی نے کیا ہے؟ کیا مقنّنہ، عدلیہ، انتظامیہ اور فوج کے کار پرداز ان جرائم میں شریک نہیں رہے؟ اور کیا علما، اساتذہ، دانش ور، صحافی اور مذہبی رہنما ان سے بری الذمہ قرار دیے جا سکتے ہیں؟

اصلاح احوال کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سیاسی نظام کو اس کی فطری رفتار کے مطابق کسی مداخلت کے بغیر چلنے کا موقع دیا جائے۔ دنیا کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ کوئی بھی نظام شکست و ریخت کے عمل سے گزرے بغیر استحکام نہیں حاصل کر سکتا۔ چنانچہ اس ملک کے لیے سب سے بڑی خیر خواہی اگر کچھ ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ اس کے سیاسی عمل میں کوئی رخنہ اندازی نہ کی جائے۔ حکومتیں اگر روز بدلتی ہیں تو انھیں بدلنے دیا جائے، پارلیمنٹ اگر غلط قانون سازی کرتی ہے تو اسے کرنے دی جائے، سیاست دان اگر اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے ہیں تو ایسا ہونے دیا جائے۔ ان کی گوشمالی اور تقرر و تنزل کا اختیار صرف اور صرف عوام کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ عمل اگر پچیس تیس سال تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے تو اسی صورت میں حقیقی اور مثبت سیاسی تبدیلی آ سکتی ہے۔

منظور الحسن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

سورۃ البقرۃ

(۴۰)

گزشتہ سے پیوستہ

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ وَاَحْسِنُوْا، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ ﴿۱۹۵﴾

اور (اِس جہاد کے لیے) اللہ کی راہ میں انفاق کرو، اور (اِس سے گریز کر کے) اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو[529] اور (انفاق) خوبی کے ساتھ کرو۔[530] اِس لیے کہ اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۱۹۵

[۵۲۹] اصل میں 'ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'التھلکۃ' مصدر ہے اور 'بایدیکم' سے پہلے 'انفسکم' کا لفظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گیا ہے۔ سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۴۲ میں یہی بات 'یھلکون انفسکم' کے الفاظ میں ادا کی گئی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں اس سے ایک ایسے شخص کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے کسی دریا یا غار میں چھلانگ لگا رہا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے موقعوں پر جان و مال کی قربانی سے جی چراتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ زندگی اور مال کے حریص جس چیز کو کامیابی سمجھتے ہیں، اللہ کی نگاہ میں وہی ہلاکت ہے۔

[۵۳۰] اصل میں لفظ 'احسنوا' آیا ہے۔ اس کا عطف 'انفقوا' پر ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں اپنا پسندیدہ مال خرچ کرو اور اسے پورے جوش و جذبہ اور دل کی آمادگی کے ساتھ خرچ کرو۔ انفاق کا یہی طریقہ اللہ کو پسند ہے۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات پر بھی اس کے بارے میں اسی بات کی تاکید کی گئی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ ، فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ ، وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ، فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ بِهٖۤ اَذًى

اور حج وعمرہ[531] (کی راہ اگر تمھارے لیے کھول دی جائے تو اُن کے تمام مناسک کے ساتھ اُن) کو اللہ ہی کے لیے پورا کرو۔[532] لیکن راستے میں گھر جاؤ[533] تو ہدیے کی جو قربانی بھی میسر ہو، اُسے پیش کر دو،[534] اور اپنے سر اُس وقت تک نہ مونڈو، جب تک یہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔[535] پھر جو بیمار ہو یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ قربانی سے پہلے ہی سر منڈانے پر مجبور ہو جائے) تو اُسے چاہیے کہ روزوں یا صدقہ یا قربانی کی

---

[۵۳۱] ان عبادات کا ذکر یہاں جس طریقے سے ہوا ہے، اس سے واضح ہے کہ اہل عرب کے لیے یہ کوئی اجنبی چیزیں نہ تھیں۔ ان کی تاریخ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ حج وعمرہ کے مناسک اور حدود وآداب سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں بعض بدعات انھوں نے داخل کر دی تھیں، لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ عبادات کیا ہیں۔ قرآن نے اسی بنا پر ان کی تفصیل نہیں کی۔ اس کا بیان اس معاملے میں بدعات کی اصلاح اور ان کے مناسک سے متعلق بعض ضروری توضیحات تک ہی محدود ہے۔

[۵۳۲] اصل الفاظ ہیں: 'و اتموا الحج و العمرة للّٰه'۔ یعنی اس صورت میں کوئی رعایت نہ ہوگی۔ تمام مناسک، جس طرح کہ وہ ہیں، اسی طرح پورے کیے جائیں گے۔ اس جملے میں زور لفظ 'للّٰه' پر ہے۔ یعنی حج وعمرہ کی یہ عبادات صرف اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہونی چاہییں۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اہل عرب کے لیے یہ دونوں عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گئی تھیں اور ان کا حج وعمرہ صرف اللہ، پروردگار عالم ہی کے لیے نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کے وہ معبودان باطل بھی اس میں شریک تھے جن کے بت انھوں نے عین بیت الحرام میں بھی اور حج کے دوسرے مقامات پر بھی نصب کر دیے تھے۔

[۵۳۳] اس سے آگے 'فاذا امنتم' کے جو الفاظ آئے ہیں، ان سے واضح ہے کہ اس سے مراد یہاں دشمن کی طرف سے گھیر لیا جانا ہے، لیکن یہی صورت بعض دوسرے موانع کی وجہ سے پیش آ جائے تو اس کا حکم بھی، ظاہر ہے کہ اس سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔

[۵۳۴] یعنی اس صورت میں قربانی پیش کرنا ضروری ہوگا اور مجبوری کی اس حالت میں یہ حج وعمرہ کے تمام مناسک کی قائم مقام ہو جائے گی۔

[۵۳۵] عام حالات میں قربانی کی جگہ اور وقت، دونوں متعین ہیں، لیکن جس صورت کا یہاں ذکر ہے، اس میں قربانی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مِّنْ رَّاْسِہٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ـ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ، فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ـ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ـ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْآ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ـ ﴿١٩٦﴾

صورت میں اُس کا فدیہ دے[536]۔ پھر جب امن کی حالت پیدا ہو جائے تو جو کوئی عمرے (کے سفر) سے یہ فائدہ اٹھائے کہ اُسی کے ساتھ ملا کر حج بھی کر لے تو اُسے قربانی کرنا ہو گی، جیسی بھی میسر ہو جائے۔ اور اگر قربانی میسر نہ ہو تو روزے رکھنا ہوں گے، تین حج کے زمانے میں اور سات (حج سے) واپسی کے بعد۔ یہ پورے دس دن ہوئے۔ (اِس طریقے سے ایک ہی سفر میں عمرے کے ساتھ ملا کر حج کی) یہ (رعایت) صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر در مسجد حرام کے پاس نہ ہوں[537]۔ (اس کی پابندی کرو) اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ ۱۹۶

کے پہنچنے کی جگہ وہی ہے، جہاں کوئی شخص گھر جائے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔

[۵۳۶] اصل میں 'ففدية من صيام او صدقة او نسك' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کا یہ اسلوب دلیل ہے کہ فدیے کی تعداد اور مقدار کا معاملہ لوگوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بخاری کی روایت (رقم ۱۸۱۴) ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: تین روزے رکھ لیے جائیں یا ۶ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جائے یا ایک بکری ذبح کر دی جائے تو کافی ہو جائے گا۔

[۵۳۷] اس سے واضح ہے کہ آدمی کے لیے ممکن ہو تو بہتر یہی ہے کہ وہ عمرہ کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرے۔ ایک ہی سفر میں پہلے عمرہ اور اس کے بعد احرام کھول کر حج کی تاریخوں میں اس کے لیے نیا احرام باندھ کر حج کرنا حدود حرم کے باہر سے آئے ہوئے عازمین حج کے لیے محض ایک رخصت ہے جو اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ سفر کی زحمت کے پیش نظر انھیں مرحمت فرمائی ہے۔ اس پر فدیہ اسی لیے لازم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس رخصت سے فائدہ بھی ہر مسلمان کو اسے رخصت سمجھ کر ہی اٹھانا چاہیے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

طالب محسن

بھرے ہوئے ہاتھ

(مشکوٰۃ المصابیح حدیث:۹۲)

و عن أبی هريرة رضی اللّٰه عنه قال : قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه و سلم : يد اللّٰه ملأی لا تغيضها نفقة سحاء الليل و النهار ، أرأيت ما أنفق مذ خلق السماء و الأرض ؟ فإنه لم يغض ما فی يده ، و كان عرشه علی الماء ، و بيده الميزان يخفض و يرفع۔

وفی رواية مسلم : يمين اللّٰه ملأی ـ قال ابن نمير ملآن ـ سحاء لا يغيضها شیء الليل و النهار۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں۔کوئی خرچ اس میں کمی نہیں کرتا، (یہاں تک کہ) صبح شام پانی کی طرح بہانا بھی۔کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ (اللہ تعالیٰ نے) جب سے یہ زمین و آسمان تخلیق کیے ہیں کیا کچھ خرچ کر ڈالا ہے۔چنانچہ، اس کے ہاتھ میں جو کچھ ہے، اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔اس کا تخت پانی پر تھا۔اس کے ہاتھ میں ترازو ہے، وہ اسے جھکاتا اور اٹھاتا ہے۔

مسلم کی روایت میں ہے دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے۔ابن نمیر نے 'ملآن' روایت کیا ہے۔صبح شام پانی کی طرح بہانے والا، کوئی چیز اس میں کمی نہیں کرتی۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

یـد اللّٰہ : 'ید' کا لفظ یہاں اللہ تعالیٰ کے خزائن کے بھرپور ہونے اور ہمہ وقت عطا و عنایت کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ اسی معنی کے لیے قرآن مجید میں 'یداہ مبسوطتان' (مائدہ ۵:۶۴) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

ملأی: یہ 'ملآن' سے 'فعلی' کے وزن پر مؤنث کا صیغہ ہے اور یہ 'یداللّٰہ' کی خبر ہونے کی وجہ سے محلاً مرفوع ہے۔ اس کے معنی بھرے ہوئے کے ہیں۔

لاتغیضھا: 'غاض یغیض' کا مطلب ہے کم کر دینا۔

سحاء اللیل والنھار: 'سحاء سح' سے اسم صفت ہے، جس کے معنی اوپر سے نیچے پانی بہانے کے ہیں۔ یہاں یہ دوسری خبر ہے اور اس کے معنی بے دریغ خرچ کرنے والے کے ہیں۔ دونوں خبریں بغیر حرف عطف کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نہ ہاتھوں کے بھرے ہونے میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے اور نہ پانی کی طرح مال کے صرف ہونے میں کوئی کمی آتی ہے۔ 'اللیل و النھار' ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

متون

بعض روایات میں 'ید اللّٰہ ملأی' سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے: 'یا ابن آدم أنفق أنفق علیك' ۔ (آدم کے بیٹے، خرچ کر میں تم پر خرچ کروں گا)۔ یہ ایک اہم فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلا جملہ اس جملے کے لیے بطور استدلال آیا ہے۔ کچھ روایات میں 'ید اللّٰہ' کی جگہ 'یمین اللّٰہ' یا 'یمین الرحمن' کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔ 'لاتغیضھا نفقۃ' کی بجائے 'لا یغیضھا شیء' یا 'سحاء لایغیضھا اللیل و النھار' بھی روایت ہوا ہے۔ اسی طرح یہ جملہ کچھ روایات میں اس طرح مروی ہے کہ 'اللیل و النھار' بطور ظرف آئے ہیں اور 'یغیضھا' والا جملہ یا تو مروی نہیں یا اس میں فاعل کی حیثیت سے 'شیء' کا لفظ آیا ہے۔ 'أرأیتم' والا جملہ ابن ماجہ کی ایک روایت میں 'میزان' والے جملے کے بعد ہے۔ کچھ روایات میں یہ جملہ 'أرأیتم' کی تمہید کے بغیر ہے اور اسی طرح اس جملے میں کچھ راوی 'لم یغض' کے بجائے 'لم ینقص' کے الفاظ روایت کرتے ہیں۔ 'بیدہ میزان' والا جملہ بعض روایات میں 'بیدہ الأخری میزان' یا 'بیدہ القبض أو القیض' کی صورت میں آیا ہے۔ معنی کے اعتبار سے ان میں سے کوئی بھی فرق کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ علاوہ ازیں اس روایت کے کچھ اجزا بیان ہوئے ہیں اور کچھ بیان نہیں ہوئے۔

معنی

اس روایت میں بھی سابقہ روایت کی طرح اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات بیان ہوئی ہیں۔ پہلی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ

اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بھرے ہوئے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے خزانے نعمتوں سے معمور ہیں اور ان خزانوں سے یہ نعمتیں صبح و شام مخلوقات کو اس طرح عطا کی جاری ہیں جیسے پانی بہایا جا رہا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں اس سے کچھ بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے خزانے بے نہایت ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی وضاحت کے لیے ہمارے سامنے موجود ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آپ نے فرمایا: تم اندازہ کر سکتے ہو کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ صرف کر ڈالا ہے۔ لیکن اس کے خزانوں میں اس سے ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اس روایت میں یہ بات ایک خبر کے طور پر نقل ہوئی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم متون میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ جملے ''اے بنی آدم خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا'' کے لیے استدلال کے طور پر آئے ہیں۔ اس صورت میں یہ انفاق کی ترغیب کے موقع پر کہے گئے جملے ہیں۔ انفاق میں انسان کی کمزوری کا ایک باعث انسان کا یہ احساس ہے کہ اس نے جو کچھ کمایا ہے اور پس انداز کر کے رکھا ہے، انفاق کے نتیجے میں اس میں کمی واقع ہو جائے گی اور اسے بازیاب کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ گویا یہ انسان کے اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے پر اعتماد میں کمی کا مظہر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرمایا ہے کہ جس کے دیے سے تم دیتے ہو، اس کے خزانے معمور ہیں۔ اس کی نعمتیں ہمہ وقت برستی رہتی ہیں۔ ان نعمتوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی کہ تم کسی اندیشے میں مبتلا ہو کر اپنا ہاتھ روک لو۔

''اے بنی آدم خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا'' یہ جملہ بظاہر ایک وعدے کا جملہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر اسے آخرت سے متعلق مان لیا جائے تو اس میں کوئی الجھن نہیں ہے۔ آخرت میں ہر عمل کا اجر دیا جائے گا، یہ خدا کا وعدہ ہے اور یہ وعدہ ہر حال میں پورا ہوگا۔ اگر اسے دنیا سے متعلق مانا جائے تو یہ کسی وعدے کا جملہ نہیں ہے کہ جب بھی کوئی بندہ خرچ کرے گا، اللہ تعالیٰ لازماً اس پر خرچ کریں گے۔ اس صورت میں اس سے مراد صرف یہ ہے کہ بندۂ مومن کو یاس یا اندیشوں میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خرچ کرے، رزق کا معاملہ خدا پر ہے اور رزق میں کمی بیشی کا باعث محض اپنی تدبیر کو نہ سمجھے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہیں جو اپنے آزمایش کے اصول کے تحت کسی کو کشادہ دست رکھتے ہیں اور کسی کو تنگ دست۔ یہ اسی طرح کا جملہ ہے جس طرح کا جملہ قرآن مجید میں قتل اولاد سے روکنے کے لیے آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

لَا تَقۡتُلُوۡٓا اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ نَحۡنُ نَرۡزُقُہُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ ۔ (۱۷:۳۱)

''اپنی اولاد کو تنگ دستی کے اندیشے کے تحت قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔''

اس آیت میں بھی انسان کو اس غلط فہمی سے نکالنا مقصود ہے کہ وہ خدا کے رازق ہونے کے معاملے کو نظر انداز کر کے محض اندیشوں کی بنیاد پر قتل نفس، بلکہ اس سے بھی آگے قتل اولاد جیسے جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی بات واضح کی ہے کہ رزق کے بارے میں اندیشوں میں مبتلا ہو کر انسان خرچ کرنے میں دریغ نہ کرے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس روایت میں دوسری بات یہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر ہے۔ روایت کی یہ بات قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ عام طور پر شارحین نے اسے ایک مستقل معاملے کی حیثیت سے لیا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جہاں یہ بات بیان ہوئی ہے، وہاں اس کے معنی یہ نہیں ہیں، بلکہ اس سے ہماری اس دنیا کے ایک دور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَهُوَ الَّذِیُ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرُضَ فِیُ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرُشُهٗ عَلَی الُمَآءِ لِیَبُلُوَکُمُ اَیُّکُمُ اَحُسَنُ عَمَلًا۔ (ہود ۱۱: ۷)

''اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تمھیں جانچے کہ کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

'وکان عرشه علی الماء' عرش خدا کی حکومت کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ کہ اس کرۂ ارض کی خشکی نمودار ہونے سے پہلے پہلے یہ سارا کرہ مائی تھا اور اللہ کی حکومت اس پر تھی۔ پھر پانی سے خشکی نمودار ہوئی اور زندگی کی مختلف النوع انواع ظہور میں آئیں اور درجہ بدرجہ یہ پورا عالم ہستی آباد ہوا۔ یہی بات تورات میں بھی بیان ہوئی ہے اگرچہ اس کے مترجموں نے مطلب خبط کر دیا ہے۔ کتاب پیدایش کی پہلی ہی آیت میں یہ الفاظ ہیں: ''اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی۔'' (تدبر قرآن ۴/ ۱۰۹)

تیسری بات زمین و آسمان میں قائم میزان سے متعلق ہے۔ اس کی وضاحت ہم سابقہ روایت کے جملے 'یخفض القسط و یرفعه' کے تحت تفصیل سے کر چکے ہیں۔ یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

کتابیات

بخاری: کتاب تفسیر القرآن، رقم ۴۳۱۶؛ کتاب النفقات، رقم ۴۹۳۳؛ کتاب التوحید، رقم ۶۸۶۲، ۶۸۶۹۔ مسلم: کتاب الزکوٰۃ، رقم ۱۶۵۸، ۱۶۵۹۔ ابن ماجہ: المقدمہ، رقم ۱۹۳۔ احمد، رقم ۶۹۹۷، ۷۷۹۳، ۷۸۰۶، ۹۶۰۶، ۱۰۰۹۶۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۶۲۶۰۔ مسند الحمیدی، رقم ۱۰۶۷۔ السنن الکبری، رقم ۱۱۲۳۹۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانون معاشرت

(۸)

(گزشتہ سے پیوستہ)

ایلا

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآءِ هِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ، فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ ، فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (البقرہ ۲: ۲۲۶۔ ۲۲۷)

’’اُن لوگوں کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے جو اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھیں۔ پھر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور اگر طلاق کا فیصلہ کر لیں تو (اُنھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ سمیع و علیم ہے۔‘‘

سورۂ بقرہ کی اس آیت میں عورتوں سے ’ایلاء‘ کا حکم بیان ہوا ہے۔ یہ عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم بیوی سے زن و شو کا تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا لینا ہے۔ اس طرح کی قسم اگر کھا لی جائے تو اس سے بیوی چونکہ معلق ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ چیز عدل و انصاف اور بر و تقویٰ کے منافی ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے چار مہینے کی مدت مقرر کر دی ہے۔ شوہر پابند ہے کہ اس کے اندر یا تو بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لے یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اس کو طلاق دے دے۔

پہلی صورت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے۔ یعنی اگرچہ یہ قسم حق تلفی کے لیے کھائی گئی تھی اور اس طرح کی قسم کھانا کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے، لیکن اصلاح کر لی جائے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیں گے۔ اس میں، ظاہر ہے کہ شوہر قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرے گا۔

دوسری صورت کے بارے میں فرمایا ہے کہ اللہ سمیع و علیم ہے۔ یعنی اگر طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے تو اس میں اللہ کا قانون اور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس کے حدود وقیود ہر حال میں پیش نظر رہنے چاہییں۔ اللہ ہر چیز کو سنتا اور جانتا ہے۔ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگی تو وہ ہرگز اس سے چھپی نہ رہے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ عذر معقول کے بغیر بیوی سے ازدواجی تعلق منقطع کر لینا کسی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس کے لیے اگر قسم بھی کھا لی گئی ہے تو اسے توڑ دینا ضروری ہے۔ یہ عورت کا حق ہے اور اسے ادا نہ کرنے پر دنیا اور آخرت، دونوں میں شوہر کو مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

ظہار

اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِہِمۡ مَّا ہُنَّ اُمَّہٰتِہِمۡ ، اِنۡ اُمَّہٰتُہُمۡ اِلَّا الّٰٓیِٔۡ وَلَدۡنَہُمۡ ، وَاِنَّہُمۡ لَیَقُوۡلُوۡنَ مُنۡکَرًا مِّنَ الۡقَوۡلِ وَزُوۡرًا ، وَ اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ۔ وَالَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا ، فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا۔ ذٰلِکُمۡ تُوۡعَظُوۡنَ بِہٖ ، وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ۔ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ فَصِیَامُ شَہۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا، فَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ فَاِطۡعَامُ سِتِّیۡنَ مِسۡکِیۡنًا۔ ذٰلِکَ لِتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ، وَتِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ ، وَلِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۔

(المجادلہ ۵۸: ۲۔۴)

''تم میں سے جو اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھتے ہیں، وہ اُن کی مائیں نہیں بن جاتی ہیں۔ اُن کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے اُن کو جنا ہے۔ اِس طرح کے لوگ، البتہ ایک نہایت بیہودہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مغفرت فرمانے والا ہے۔ اور (اِس معاملے میں حکم یہ ہے کہ) جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھیں، پھر اُسی بات کی طرف پلٹیں جو اُنھوں نے کہی تھی تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کیا جائے گا۔ یہ بات ہے جس کی تمھیں نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح واقف ہے۔ پھر جسے غلام میسر نہ ہو، اُسے دو مہینے کے پے در پے روزے رکھنا ہوں گے، اِس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اور جو یہ بھی نہ کر سکے تو وہ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلا دے۔ یہ اِس لیے ہے کہ تم اللہ اور اُس کے رسول کو فی الواقع مانو۔ اور یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، (اِنھیں اللہ اور رسول کے منکر ہی توڑتے ہیں)، اور اِس طرح کے منکروں کے لیے بڑی دردناک سزا ہے۔''

یہ 'ظہار' کا حکم ہے۔ ایلا کی طرح ظہار بھی عرب جاہلیت کی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ شوہر نے بیوی کے لیے 'انت علی کظھر امی' (تجھے ہاتھ لگایا تو گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگایا) کے الفاظ زبان سے نکال دیے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں بیوی کو اس طرح کی بات کہہ دینے سے ایسی طلاق پڑ جاتی تھی جس کے بعد بیوی لازماً شوہر سے الگ ہو جاتی تھی۔ اہل عرب سمجھتے تھے کہ یہ الفاظ کہہ کر شوہر نہ صرف یہ کہ بیوی سے اپنا رشتہ توڑ رہا ہے، بلکہ اسے ماں کی طرح اپنے اوپر حرام قرار دے رہا ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک طلاق کے بعد تو رجوع کی گنجایش ہو سکتی تھی، لیکن ظہار کے بعد اس کا کوئی امکان باقی نہ رہتا تھا۔[24]

قرآن نے یہ اسی کا حکم بیان کیا ہے۔ اس میں پہلی بات یہ واضح کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص منہ پھوڑ کر بیوی کو ماں سے یا اس کے کسی عضو کو ماں کے کسی عضو سے تشبیہ دے دیتا ہے تو اس سے بیوی ماں نہیں ہو جاتی اور نہ اس کو وہ حرمت حاصل ہو سکتی ہے جو ماں کو حاصل ہے۔ ماں کا ماں ہونا ایک امر واقعی ہے، اس لیے کہ اس نے آدمی کو جنا ہے۔ اس کو جو حرمت حاصل ہوتی ہے، وہ اسی جننے کے تعلق سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ابدی اور فطری حرمت ہے جو کسی عورت کو محض منہ سے ماں کہہ دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس طرح کی تشبیہ سے نہ کسی کا نکاح ٹوٹتا ہے اور نہ اس کی بیوی اس کے لیے ماں کی طرح حرام ہو جاتی ہے۔ سورۂ احزاب میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ۔ (۳۳: ۴) ”اور اپنی جن بیویوں سے تم ظہار کرتے ہو، اللہ نے اُن کو تمھاری مائیں نہیں بنایا ہے۔“

دوسری یہ واضح کی گئی ہے کہ اس طرح کی بات اگر کسی شخص نے کہی ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک نہایت بیہودہ اور جھوٹی بات ہے جس کا تصور بھی کسی شریف آدمی کو نہیں کرنا چاہیے، کجا یہ کہ وہ اسے زبان سے نکالے۔ اس پر سخت محاسبہ ہو سکتا تھا، لیکن اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مغفرت فرمانے والا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر اشتعال میں آ کر اس طرح کی خلاف حقیقت بات منہ سے نکال بیٹھے اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو تو اللہ اس سے درگزر فرمائیں گے۔

تیسری یہ واضح کی گئی ہے کہ اس کے یہ معنی بہرحال نہیں ہیں کہ اسے بغیر کسی تنبیہ کے چھوڑ دیا جائے۔ انسان کی معاشرتی زندگی پر اس طرح کی باتوں کے اثرات بڑے غیر معمولی ہوتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کی تادیب کی جائے تاکہ آیندہ وہ بھی احتیاط کرے اور دوسروں کو بھی اس سے سبق حاصل ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے اسے اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

یہ کفارہ درج ذیل ہے:

ایک لونڈی یا غلام آزاد کیا جائے۔[25]

---

۲۴ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۵/۵۵۱۔

۲۵ اصل میں لفظ 'رقبة' استعمال ہوا ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ لونڈی یا غلام کی کوئی تخصیص نہیں ہے،

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وہ میسر نہ ہو تو پے در پے[26] دو مہینے کے روزے رکھے جائیں۔

یہ بھی نہ ہو سکے تو ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس حکم کی تعمیل اگر اس کی صحیح روح کے ساتھ کرو گے تو اس سے اللہ اور رسول پر تمھارا ایمان محکم ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اگر اپنی کسی غلطی کی تلافی اس طرح کی کوئی مشقت اٹھا کر کرتا ہے تو اس سے غلطی کی تلافی بھی ہو جاتی ہے اور اسے اپنے ایمان و عقیدہ میں رسوخ بھی حاصل ہوتا ہے۔

[باقی]

دونوں میں سے جو بھی میسر ہو، اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا۔ غلاموں کی آزادی کے لیے جو اقدامات اسلام نے کیے، یہ بھی انھی میں سے ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بعد کی دونوں صورتوں پر مقدم رکھا ہے۔ غلامی ختم ہو جانے کے بعد اب ظاہر ہے کہ یہی دونوں صورتیں باقی رہ گئی ہیں۔

۲۶۔ اصل میں 'متتابعین' کا لفظ آیا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر دو مہینے کے روزے پورے ہونے سے پہلے کسی شخص نے بیوی سے ملاقات کر لی تو اسے از سر نو پورے روزے رکھنا ہوں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عمار خان ناصر

تفسیر کبیر کا تعارف

''مفاتیح الغیب'' یعنی تفسیر کبیر کا شمار تفسیر بالرائے کے طریقہ پر لکھی گئی اہم ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس کی تصنیف چھٹی صدی ہجری کے نامور عالم اور متکلم امام محمد فخر الدین رازی (۵۴۳ھ۔۶۰۶ھ) نے شروع کی، لیکن اس کی تکمیل سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں اس کی تکمیل، حاجی خلیفہ کی رائے کے مطابق قاضی شہاب الدین بن خلیل الخولی الدمشقی نے اور ابن حجر کی رائے کے مطابق شیخ نجم الدین احمد بن محمد القمولی نے کی۔ یہ بات بھی معین طور پر معلوم نہیں کہ تفسیر کا کتنا حصہ خود امام صاحب لکھ پائے تھے۔ ایک قول کے مطابق سورۂ انبیا تک، جبکہ دوسرے قول کے مطابق سورۂ فتح تک تفسیر امام صاحب کی اپنی لکھی ہوئی ہے۔[1] تاہم اس معاملے میں سب سے زیادہ تشفی بخش اور مدلل نقطۂ نظر الاستاذ عبدالرحمٰن المعلمی نے اپنے مضمون ''حول تفسیر الفخر الرازی'' میں اختیار کیا ہے۔ انھوں نے مضبوط داخلی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ تفسیر کے درج ذیل حصے خود امام صاحب نے لکھے ہیں، جبکہ باقی اجزا الخولی یا القمولی کے لکھے ہوئے ہیں:

۱۔ سورۂ فاتحہ تا سورۂ قصص

۲۔ سورۂ صافات، سورۂ احقاف

۳۔ سورۂ حشر، مجادلہ اور حدید

۴۔ سورۂ ملک تا سورۂ ناس[2]

---

[1] التفسیر والمفسرون ۱/۲۹۱۔ محمد تقی عثمانی، علوم القرآن، ۵۰۴۔

[2] ضیاء الدین، تفسیر کبیر اور اس کا تکملہ، مشمولہ ایضاح القرآن، کراچی ۲۰۶۔ ۲۴۸۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خصوصیات

جامعیت

تفسیر کبیر کی نمایاں ترین خصوصیت، جس کا اعتراف اکابر اہل علم نے کیا ہے، اس کی جامعیت ہے۔ وہ جس مسئلہ پر لکھتے ہیں، اس کے متعلق جس قدر مباحث ان سے پہلے پیدا ہو چکے ہیں، ان سب کا استقصا کر دیتے ہیں۔ محمد حسین ذہبی لکھتے ہیں:

''رازی کی تفسیر کو علما کے ہاں عام شہرت حاصل ہے کیونکہ دوسری کتب تفسیر کے مقابلے میں اس کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مختلف علوم سے متعلق وسیع اور بھرپور بحثیں ملتی ہیں۔'' (التفسیر والمفسرون ۱/۲۹۳)

علامہ انور شاہ صاحب کشمیری فرماتے ہیں:

''قرآن کریم کی مشکلات میں مجھے کوئی مشکل ایسی نہیں ملی جس سے امام رازی نے تعرض نہ کیا ہو، یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات مشکلات کا حل ایسا پیش نہیں کر سکے جس پر دل مطمئن ہو جائے۔'' (البنوری، محمد یوسف، یتیمۃ البیان ۲۳)

طریق تفسیر

ہر آیت کی تفسیر میں امام صاحب کا طریقہ حسب ذیل ہے:

۱۔ آیت کی تفسیر، نحوی ترکیب، وجوہ بلاغت اور شان نزول سے متعلق سلف کے تمام اقوال نہایت مرتب اور منضبط انداز میں پوری شرح و وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

۲۔ آیت سے متعلق فقہی احکام کا ذکر تفصیلی دلائل سے کرتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے مذہب کو ترجیح دیتے ہیں۔

۳۔ متعلقہ آیات کے تحت مختلف باطل فرقوں مثلاً جہمیہ، معتزلہ، مجسمہ وغیرہ کا استدلال تفصیل سے ذکر کر کے اس کی تردید کرتے ہیں۔

ان میں سے پہلے دو امور کا ذکر اگرچہ دوسرے اہل تفسیر بھی کرتے ہیں، لیکن یہ ذخیرہ ان میں منتشر اور بکھرا ہوا ہے، جبکہ تفسیر کبیر میں یہ تمام مباحث یک جا مل جاتے ہیں۔ البتہ تیسرے امر کے اعتبار سے تفسیر کبیر اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر ہے۔

ترجیح ومحاکمہ

امام صاحب نے اپنی تفسیر میں جمع اقوال پر اکتفا نہیں کی، بلکہ دلائل کے ساتھ بعض اقوال کو ترجیح دینے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس سے تفسیر کے متعلقہ علوم وفنون میں ان کی دسترس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ تفسیر گویا سابقہ تفسیری ذخیرے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پر ایک محاکمہ کا درجہ رکھتی ہے۔

مختلف تفسیری اقوال میں ترجیح قائم کرتے ہوئے امام صاحب بالعموم حسب ذیل اصول پیش نظر رکھتے ہیں:

۱۔ اگر کسی قول کی تائید میں صحیح حدیث موجود ہو تو اس کو ترجیح دیتے ہیں۔

'ونفخ فی الصور' کی تفسیر میں تین اقوال نقل کرتے ہیں: ایک یہ کہ صور ایک آلہ ہے، جب اس کو پھونکا جائے گا تو ایک بلند آواز پیدا ہو گی۔ اس کو خداوند تعالیٰ نے دنیا کی بربادی اور اعادۂ اموات کی علامت قرار دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ لفظ بفتح الواو ہے اور 'صورة' کی جمع ہے۔ مراد یہ ہے کہ ''جب صورتوں میں روح پھونکی جائے گی۔'' تیسرا یہ کہ یہ ایک استعارہ ہے، جس کا مقصد مردوں کا اٹھانا اور ان کو جمع کرنا ہے۔ امام رازی نے ان اقوال میں سے پہلے قول کو اس بنا پر ترجیح دی ہے کہ اس کی تائید میں رسول اللہ کی حدیث موجود ہے[۳]۔

۲۔ جو مفہوم عقل کے مطابق ہو، اس کو راجح قرار دیتے ہیں۔

سورۂ نساء کی آیت 'خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها' کی تفسیر میں عام مفسرین کا خیال یہ ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا اور اس کی تائید میں حدیث بھی موجود ہے۔ لیکن امام رازی ابومسلم کی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں جن کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کی جنس سے ان کی بیوی کو پیدا کیا۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کر سکتے تھے، اسی طرح حضرت حوا علیہا السلام کو بھی کر سکتے تھے، پھر ان کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی[۴]؟

اسی طرح سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے قصہ میں ارشاد باری ہے:

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ ۔ (الکہف ۱۸:۸۶)	''یہاں تک کہ جب وہ آفتاب کے غروب ہونے کے مقام پر پہنچا تو سورج کو کیچڑ کی ایک نہر میں ڈوبتے دیکھا۔''

اس کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ سورج درحقیقت کیچڑ میں ڈوبتا ہے، لیکن امام رازی کے نزدیک یہ تفسیر بالکل عقل کے خلاف ہے، کیونکہ سورج زمین سے کئی گنا بڑا ہے اس لیے وہ زمین کی کسی نہر میں کیسے ڈوب سکتا ہے[۵]؟

۳۔ جب تک کسی لفظ کا حقیقی اور معروف معنی مراد لینا ممکن ہو، اس وقت تک اس کا مجازی یا غیر معروف معنی مراد نہیں

۳۔ التفسیر الکبیر ۲۴/ ۲۲۰۔

۴۔ التفسیر الکبیر ۹/ ۱۶۱۔

۵۔ التفسیر الکبیر ۲۱/ ۱۶۷۔

لیتے۔

مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں 'وفار التنور' کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ لفظ 'تنور' کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہی تنور ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد سطح زمین ہے۔ تیسرا یہ کہ اس سے مراد زمین کا بلند حصہ ہے۔ چوتھا یہ کہ اس سے مراد طلوع صبح ہے۔ پانچواں یہ کہ یہ محاورتاً واقعہ کی شدت کی تعبیر ہے۔ ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد امام رازی لکھتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ کلام کو حقیقی معنی پر محمول کرنا چاہیے اور حقیقی معنی کے لحاظ سے تنور اسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں روٹی پکائی جاتی ہے[6]۔

اسی طرح 'ومن یغلل یات بما غل یوم القیامة'، ''جس نے مال غنیمت میں خیانت کی، وہ اس مال کے ساتھ قیامت کے دن حاضر ہوگا'' کی تفسیر میں دو قول نقل کرتے ہیں: ایک یہ کہ حقیقتاً ایسا ہی ہوگا۔ دوسرا یہ کہ اس تعبیر سے محض عذاب کی سختی بیان کرنا مقصود ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ علم قرآن میں جو اصول معتبر ہے، وہ یہ ہے کہ لفظ کو اس کے حقیقی معنی پر قائم رکھنا چاہیے، الا یہ کہ کوئی اور دلیل اس سے مانع ہو۔ یہاں چونکہ ظاہری معنی مراد لینے میں کوئی مانع نہیں اس لیے اسی کو قائم رکھنا چاہیے[7]۔

۴۔ اس قول کو مختار قرار دیتے ہیں جو کلام کی نحوی ترکیب کے وجوہ میں سے بہتر وجہ کے مطابق ہو۔

سورۂ بقرہ کی آیت 'ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر وما انزل علی الملکین' کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ 'ما انزل' میں 'ما' نافیہ ہے یا موصولہ، نیز اس کا عطف 'السحر' پر ہے یا 'ما تتلوا الشیاطین' پر۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ 'ما' کو موصولہ قرار دینا اور اس کا عطف 'السحر' پر کرنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ جو لفظ قریب ہے، اس پر عطف کرنا بعید لفظ پر عطف کرنے سے زیادہ مستحسن ہے[8]۔

آیات وسور میں باہمی ربط

امام رازی قرآن مجید میں نظم کے قائل ہیں اور اپنی تفسیر میں آیات اور سورتوں کا باہمی ربط نہایت اہتمام سے بیان کرتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے جو کوششیں کی ہیں، ان کی اہمیت کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ مولانا تقی عثمانی کا خیال یہ ہے:

''آیتوں کے درمیان ربط ومناسبت کی جو وجوہ وہ بیان فرماتے ہیں، وہ عموماً اتنی بے تکلف، دل نشین اور معقول ہوتی ہے

۶۔ التفسیر الکبیر ۱۷/۲۲۶۔

۷۔ التفسیر الکبیر ۹/۷۳۔

۸۔ التفسیر الکبیر ۳/۲۱۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ اس پر دل نہ صرف مطمئن ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے قرآن کریم کی عظمت کا غیر معمولی تاثر پیدا ہوتا ہے۔''

(علوم القرآن،۵۰۴)

جبکہ مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں ان کی کوششیں کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئیں کیونکہ نظم قرآن کھولنے کے لیے جو محنت درکار تھی، اس کے لیے ان کے جیسے مصروف مصنف کے پاس فرصت مفقود تھی۔'' (مبادی تدبر قرآن)

تاہم اصولی طور پر امام رازی نظم کی رعایت پر نہایت شدت سے اصرار کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ حم السجدہ کی آیت 'ولو جعلناه قرآنا اعجميا لقالوا لو لا فصلت آياته' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری ہے جو ازراہ شرارت یہ کہتے تھے کہ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اتارا جاتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن اس طرح کی باتیں کہنا میرے نزدیک کتاب الٰہی پر سخت ظلم ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی آیتوں میں باہم دگر کوئی ربط و تعلق نہیں ہے، حالانکہ یہ کہنا قرآن حکیم پر بہت بڑا اعتراض کرنا ہے۔ ایسی صورت میں قرآن کو معجزہ ماننا تو الگ رہا، اس کو ایک مرتب کتاب کہنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک ایک مربوط کلام ہے۔'' (التفسیر الکبیر ۲۷/ ۱۳۴)

اس کے بعد اس آیت کی تفسیر لکھ کر فرماتے ہیں:

''ہر منصف جو انکار حق کا عادی نہیں ہے، تسلیم کرے گا کہ اگر سورہ کی تفسیر اس طرح کی جائے جس طرح ہم نے کی ہے تو پوری سورہ ایک ہی مضمون کی حامل نظر آئے گی اور اس کی تمام آیتیں ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گی۔''

(التفسیر الکبیر ۲۷/ ۱۳۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عقلی انداز

امام رازی اپنے زمانے کے عقلی اور فلسفیانہ علوم کے بلند پایہ عالم تھے۔ مسلمانوں کے مابین پیدا ہونے والے کلامی اختلافات اور ان کی مذہبی و عقلی بنیادوں پر ان کی گہری نظر تھی اور اسلام کے مختلف مسائل پر یونانی فلسفہ کے زیر اثر پیدا ہونے والے اعتراضات سے بھی وہ پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ قدرتی طور پر ان کی تفسیر پر عقلی رنگ غالب ہے اور ان کی بحثوں میں ان تمام علوم کی بھرپور جھلک دکھائی دیتی ہے جن کے مطالعہ کا موقع امام صاحب کو میسر آیا تھا۔ تفسیر کبیر میں اس عقلی ذوق کا اظہار حسب ذیل صورتوں میں ہوا ہے:

۱۔ اسلامی عقائد کی براہین و دلائل سے تائید

امام صاحب نہ صرف اسلامی عقائد کا دفاع بڑی حمیت اور جوش سے کرتے ہیں، بلکہ اس سلسلے میں معذرت خواہانہ رویہ کی

بھی مذمت کرتے ہیں۔ سورۂ سبا کی آیت ۱۲ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا اور جنات کو مسخر کر دیا۔ بعض لوگوں نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ ہوا سے مراد تیز رفتار گھوڑے اور جنات سے مراد طاقت ور انسان ہیں۔ امام رازی یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:

''یہ بات بالکل غلط ہے۔ کہنے والے نے اس لیے کہی ہے کہ اس کا اعتقاد کمزور ہے اور اسے اللہ کی قدرت پر اعتماد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہیں اور یہ باتیں بھی ممکنات میں سے ہیں۔'' (التفسیر الکبیر ۲۵/۲۴۷)

۲۔ اسلامی فرقوں کے کلامی جھگڑے

کلامی اختلافات امام صاحب کی دلچسپی کا خاص موضوع ہیں اور وہ موقع بموقع معتزلہ اور اشاعرہ کے مابین نزاعی مسائل پر بحثیں کرتے ہیں۔ امام صاحب اشاعرہ کے گرم جوش ترجمان ہیں اور جیسا کہ ہم آگے عرض کریں گے، ان کی حمایت میں حدود سے تجاوز بھی کر جاتے ہیں۔

۳۔ دینی حقائق کی عقلی تعبیر

امام صاحب کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی آیات جن میں عقل سے ماورا حقائق کا اظہار کیا گیا ہو، عام طریقے سے ان کی تفسیر کرنے کے بعد ان کی فلسفیانہ تعبیر بھی پیش کرتے ہیں۔

۴۔ ملحدین کے اعتراضات کے جوابات

تفسیر کبیر میں قرآنی مضامین پر ملحدین کے اعتراضات سے بکثرت تعرض کیا گیا ہے۔ ان کے جواب میں امام صاحب یا تو مناظرانہ انداز میں ان کی تردید کرتے ہیں یا آیات کی توجیہ وتاویل کر کے ان کا صحیح مفہوم واضح کرتے ہیں۔

۵۔ احکام شریعت کے اسرار

تفسیر کبیر میں بہت سے مقامات پر شرعی احکام کے اسرار اور ان کی حکمتیں بھی زیر بحث آئی ہیں۔ کتاب کے عمومی مزاج کے تحت ان کی توضیح میں بھی فلسفیانہ ذوق غالب ہے۔

اسرائیلیات

تفسیر بالروایت کے طریقے پر لکھی گئی کتب تفسیر میں ایک بڑا حصہ اسرائیلی روایات کا ہے۔ قرآن مجید میں امم سابقہ یا رسول اللہ کے زمانہ کے جن واقعات واحوال کا اجمالاً تذکرہ ہوا ہے، ان کی تفصیلات مہیا کرنے کے شوق میں غیر محتاط مفسرین نے بے سروپا روایات کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ یہ روایات بالعموم روایت کے معیار کے لحاظ سے ناقابل استناد اور عقل ودرایت کے اعتبار سے بالکل بے تکی ہیں۔ اسی لیے محقق مفسرین نے ان کو اپنی تفسیروں میں جگہ دینے سے گریز کیا ہے۔ امام رازی کا طریقہ بھی اس سلسلے میں احتیاط پر مبنی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسرائیلی روایات، درحقیقت، دو طرح کی ہیں:

بعض ایسی ہیں کہ ان میں وارد تفصیلات قرآن وسنت کے مسلمات سے تو نہیں ٹکراتیں، لیکن فہم قرآن کے حوالے سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایسی صورت میں امام رازی ان کو نقل تو کرتے ہیں، لیکن ان کی تردید یا تائید کیے بغیر یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ ان سے اعتنا کرنا ایک بے کار کام ہے، کیونکہ یہ تفسیر کے اصل مقصد کے لحاظ سے کارآمد نہیں ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جس درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا، اس کی تعیین میں تفسیری روایات مختلف ہیں۔ بعض کے مطابق یہ گیہوں کا درخت تھا، بعض کے نزدیک انگور اور بعض کے ہاں انجیر کا۔ امام رازی ان روایات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے اس درخت کی تعیین نہیں ہوتی، اس لیے ہم کو بھی اس تعیین کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس قصہ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم کو متعین طور پر اس درخت کا علم ہو۔ جو چیز کلام کا اصل مقصود نہیں ہوتی، اس کی توضیح بعض اوقات غیر ضروری ہوتی ہے۔[9]

قرآن مجید میں مذکور قیامت کی علامات میں ایک علامت دابۃ الارض کا نکلنا بھی ہے۔ مفسرین نے اس جانور کے جسم، اس کی خلقت اور اس کے نکلنے کے طریقے کے متعلق بے شمار روایات اکٹھی کی ہیں، لیکن امام رازی فرماتے ہیں کہ قرآن مجید سے ان میں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی، اس لیے اگر ان کے متعلق رسول اللہ سے کوئی حدیث مروی ہو تو وہ قبول کر لی جائے گی، ورنہ وہ ناقابل التفات قرار پائے گی۔[10]

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی ساخت اور اس کی لمبائی چوڑائی کے متعلق مختلف تفسیری اقوال نقل کر کے لکھتے ہیں کہ اس قسم کی بحثیں مجھے اچھی نہیں لگتیں، کیونکہ ان کا علم غیر ضروری ہے اور اس سے کوئی فائدہ نہیں اور ان میں غور و فکر کرنا فضول ہے، بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ہم کو یقین ہے کہ اس جگہ کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو صحیح جانب پر دلالت کرے۔[11]

دوسری قسم ان روایات کی ہے جو قرآن وسنت کے مسلمات کے صریح معارض اور ان کی بنیاد کو ڈھا دینے والی ہیں۔ ایسی روایات بالعموم بعض انبیا سابقین کے واقعات کے تحت نقل ہوئی ہیں۔ تمام محقق مفسرین نے ان کی تردید کی ہے، چنانچہ امام رازی نے بھی حسب ذیل روایات کو بے اصل قرار دیا ہے:

واقعہ ہاروت و ماروت کے ضمن میں مروی روایات جن کے مطابق یہ دونوں فرشتے تھے جو زمین پر بھیجے گئے اور ایک

---

[9] التفسیر الکبیر ۵/۳۔

[10] التفسیر الکبیر ۲۱۸/۲۴۔

[11] التفسیر الکبیر ۲۲۴/۱۷۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عورت کے ساتھ بدکاری کی خواہش میں بت پرستی، شراب نوشی اور قتل کے مرتکب ہوئے۔[12]

سورۂ اعراف کی آیت ۲۴ کے الفاظ 'فلما آتاهما صالحا جعلا له شركاء فی ما آتاهما' کے تحت مروی روایت جس میں ذکر ہے کہ اس آیت میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کا ذکر ہے جنھوں نے ابلیس کے ورغلانے میں آ کر اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔[13]

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں مروی روایت جس کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام آمادۂ گناہ ہو گئے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا جنھوں نے ان کو دھکیل کر ہٹایا اور وہ بالکل ناکارہ ہو گئے۔[14]

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ کے تحت مروی روایات جن کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام اوریا کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے خاوند کو قتل کرا کے اس سے نکاح کر لیا۔[15]

نقائص

اپنی تمام تر افادیت اور خوبیوں کے باوجود تفسیر کبیر خامیوں سے پاک نہیں ہے۔ ہم ذیل میں ان چند امور کا ذکر کرتے ہیں جن پر اہل علم نے اعتراض کیا ہے۔

غیر متعلق مباحث کی کثرت

تفسیر کبیر کے ایسے عقلی مباحث جن سے منصوصات کی تائید یا ان کی تفہیم میں مدد ملتی ہے، ان کی تمام منصف مزاج اہل علم نے قدر کی ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس تفسیر میں ایک بڑا ذخیرہ ایسے فنی مباحث کا بھی ہے جن کا قرآن کی تاویل و تشریح سے کوئی تعلق نہیں اور جنھیں امام صاحب نے محض اپنے عقلی ذوق کی تشفی کے لیے تفسیر کا حصہ بنا دیا ہے۔ محمد حسین ذہبی لکھتے ہیں:

> ''تفسیر دیکھنے سے ظاہر ہے کہ امام رازی کو زیادہ سے زیادہ نکتے استنباط کرنے اور دائرۂ گفتگو کو وسیع سے وسیع تر کرنے کا ازحد شوق ہے۔ قرآن کے الفاظ سے کسی موضوع کا ذرا بھی تعلق نظر آئے تو وہ اس کو دائرۂ بحث میں لے آتے اور اس سے متعلق نکات استنباط کرنا شروع کر دیتے ہیں۔'' (التفسیر والمفسرون ۱/۲۹۶)

۱۲؎ التفسیر الکبیر ۳/۲۱۹۔

۱۳؎ التفسیر الکبیر ۱۴/۸۶۔

۱۴؎ التفسیر الکبیر ۱۸/۱۳۰۔

۱۵؎ التفسیر الکبیر ۲۶/۱۹۲۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

تفسیر کے مقدمہ میں خود فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ان کی زبان سے یہ بات نکلی کہ سورۂ فاتحہ سے دس ہزار فوائد اور نکات استنباط کیے جا سکتے ہیں، لیکن بعض لوگوں نے اس کو ناممکن قرار دیا۔ چنانچہ میں نے اس بات کو ممکن الحصول ثابت کرنے کے لیے فاتحہ کی تفسیر میں اس قدر تطویل سے کام لیا ہے[۱۶]۔ (تفسیر کبیر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر ۲۹۰ صفحات کو محیط ہے)۔ اس ذوق کا نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کا ایک بہت بڑا حصہ ریاضی، طبیعیات، ہیئت، فلکیات، فلسفہ اور علم کلام کے طویل مباحث کی نذر کر دیا گیا ہے۔

تفسیر کبیر کا یہ پہلو غالباً تمام اہل علم کی نظروں میں کھٹکا ہے اور اس حوالے سے اس پر تنقید کی گئی ہے۔ سیوطی لکھتے ہیں:

''صاحب علوم عقلیہ بالخصوص امام رازی نے اپنی تفسیر کو حکما، فلاسفہ اور ان جیسے لوگوں کے اقوال سے بھر دیا اور ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کی طرف اس طرح نکل گئے کہ دیکھنے والا تعجب کرتا ہے کہ آیت کے موقع و محل سے اس کو کیا مطابقت ہے؟ ابوحیان بحر میں لکھتے ہیں کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بہت سی طویل چیزوں کو جمع کر دیا ہے، جن کی ضرورت علم تفسیر میں نہیں، اسی لیے بعض علما نے کہا ہے کہ تفسیر کبیر میں ہر چیز ہے، صرف ایک تفسیر نہیں ہے۔''

(السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن: الاتقان ۲/ ۱۹۰)

الدکتور محمد حسین ذہبی بھی اس کی تائید کرتے ہیں:

''خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس کتاب کو علم کلام اور طبیعی و کائناتی علوم کا انسائیکلوپیڈیا کہنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ یہ پہلو اس پر اس قدر غالب ہے کہ اس کی تفسیر ہونے کی حیثیت دب کر رہ گئی ہے۔'' (التفسیر والمفسرون ۱/ ۲۹۵)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متکلمانہ جانب داری

تفسیر کبیر پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس میں امام صاحب نے کلامی جھگڑوں کے حوالے سے ایک خاص نقطۂ نظر کی وکالت کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے حسب ذیل ہے:

''مسلمانوں کا تعلق جب عجمی قوموں سے ہوا اور ان کے علوم اور ان کے فلسفہ سے ان کو سابقہ پڑا تو دینی مسائل پر سوچنے کا وہ انداز فکر وجود میں آیا جس کو ہم علم کلام کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس علم کلام نے بھی ہمارے اندر مختلف مکتب خیال پیدا کیے اور ان میں سے ہر مکتب خیال کے لوگوں نے اپنے مخصوص افکار و نظریات کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے قرآن مجید کی تفسیریں لکھیں۔ ان تفسیروں کا مقصد، درحقیقت قرآن مجید کی تفسیر لکھنے سے زیادہ ان افکار و نظریات کے دلائل فراہم کرنا تھا جو ان تفسیروں کے لکھنے والوں نے اپنے متکلمانہ طرز فکر سے پیدا کیے تھے۔ اس طرز پر ہمارے ہاں جو تفسیریں لکھی گئیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اور اہمیت رکھنے والی تفسیریں دو ہیں: ایک علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کشاف

---

[۱۶] التفسیر الکبیر ۱/ ۳۔

اور دوسری امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کبیر۔ ان میں سے مقدم الذکر معتزلہ کے مکتب خیال کے ترجمان ہیں اور موخر الذکر اپنی تفسیر میں ہر جگہ اشاعرہ کے نظریات کی وکالت کرتے ہیں۔'' (مبادی تدبر قرآن ۱۸۵)

اشعریت کی حمایت میں امام رازی کے اس غلو کی شکایت علامہ شبلی نعمانی نے بھی کی ہے:

''امام صاحب نے علم کلام کی بنیاد اشاعرہ کے عقائد پر قائم کی اور اس سینہ زوری سے اس کی حمایت کی کہ اشاعرہ کے جو مسائل تاویل کے محتاج تھے، ان میں تاویل کا سہارا بھی نہ رکھا اور پھر ان کی صحت پر سیکڑوں دلیلیں قائم کیں۔ مثلاً اشاعرہ اس بات کے قائل تھے کہ انسان اپنے افعال پر قدرت موثرہ نہیں رکھتا، تاہم جبر سے بچنے کے لیے انھوں نے کسب کا پردہ لگا رکھا تھا۔ امام صاحب نے یہ پردہ بھی اٹھا دیا اور صاف صاف جبر کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں جا بجا اس دعویٰ کی تصریح کی ہے اور اس پر دلیلیں قائم کی ہیں۔ اسی طرح خدا کے افعال کا بغیر کسی مصلحت و حکمت کے ہونا، حسن و قبح کا عقلی نہ ہونا، زندگی کے لیے جسم کا مشروط نہ ہونا، دیکھنے کے لیے لون و جسم و جہت کا مشروط نہ ہونا، کسی شے میں کسی خاصیت کا نہ ہونا، اشیاء میں سبب و مسبب کا سلسلہ نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مسائل پر سیکڑوں دلیلیں قائم کیں اور انھی مسائل کو اعتزال اور سنیت کا معیار قرار دیا، چنانچہ ان کی تمام کتب کلامیہ اور تفسیر کبیر انھی مباحث سے بھری پڑی ہیں۔'' (شبلی نعمانی، الکلام ۶۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک مثال سے امام رازی کے اس طرز فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

امام رازی اور تمام اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو تکلیف مالا یطاق دیتا ہے، یعنی ان پر ایسا بوجھ ڈالتا ہے جس کو اٹھانے کی وہ طاقت نہیں رکھتے۔ اس پر انھوں نے اپنی تفسیر میں مختلف آیات کے ذیل میں متعدد دلیلیں بیان کی ہیں۔ لیکن سورہ بقرہ کی آخری آیت واضح طور پر ان کے اس مسلک کی تردید کرتی ہے۔ ارشاد باری ہے: 'لا یکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا'۔ ''اللہ تعالیٰ کسی انسان پر اس کی طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔'' اس آیت کی تفسیر میں انھوں نے متعدد تاویلات سے آیت کے واضح مفہوم کو پلٹنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے دوسری جگہ ایک عجیب دلیل دیتے ہوئے آیت کے ظاہری مفہوم کو رد کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"جب کہ ایک مسئلہ اپنی جگہ پر قطعی یقینی ہو تو اس کے بارے میں ظنی اور کمزور دلائل کی بنا پر کچھ کہنا ناجائز ہے۔ مثلاً 'لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا' کے متعلق قطعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی قسم کی تکلیف مالا یطاق اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ ہم اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں اس کی تائید میں پانچ نہایت محکم دلیلیں لکھ چکے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نہیں ہو سکتی جو ظاہر آیت سے معلوم ہوتی ہے۔'' (التفسیر الکبیر بحوالہ مبادی تدبر قرآن)

اہل السنۃ کی کمزور ترجمانی

بعض علما کی رائے یہ ہے کہ تفسیر کبیر میں باطل فرقوں کا استدلال تو نہایت بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے لیکن اس کے

مقابلے میں اہل سنت کی ترجمانی کمزور طریقے سے کی گئی ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں:

''ان پر یہ اعتراض ہے کہ قوی شبہات پیش کرتے ہیں، لیکن ان کا تسلی بخش جواب دینے سے عاجز رہ جاتے ہیں، چنانچہ مغرب کے بعض علما نے کہا کہ ان کے اعتراضات نقد ہوتے ہیں اور جواب ادھار۔ شیخ سراج الدین ان پر سخت اعتراض کرتے اور کہتے تھے کہ دین کے مخالفین کے اعتراضات تو نہایت قوت اور زور سے بیان کرتے ہیں، لیکن اہل سنت کی ترجمانی نہایت کمزور طریقے سے کرتے ہیں۔'' (التفسیر والمفسرون ۱/۲۹۵)

مخالف کے استدلال کو پوری قوت سے پیش کرنے کی عادت کا خود امام رازی نے بھی اعتراف کیا ہے۔ 'نہایۃ العقول' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ وہ مخالف کے استدلال کو اس عمدگی سے پیش کریں گے کہ اگر مخالف خود بھی چاہے تو اس سے اچھے طریقے سے پیش نہ کر سکے گا۔[۱۷]

۱۷؎ التفسیر الکبیر۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد بلال

مسلمانوں پر ظلم اور دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری

سوال: اس وقت مسلمانوں کی پچاس سے زائد ریاستیں ہیں۔ ہر ریاست کی ترجیحات اور مفادات الگ الگ ہیں۔ ایک ریاست کو دوسری ریاست سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں کسی ریاست پر کوئی غیر مسلم ریاست بے جا طور پر حملہ کر دے تو مسلم ریاستوں کے عوام اور ان کی حکومتیں کیا رویہ اختیار کریں؟

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جواب: پہلے ہم اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس صورت حال میں مسلم ریاستوں کے عوام کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ انھیں اس معاملے میں یہ اصولی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دین و شریعت کے اعتبار سے جہاد و قتال مسلمانوں کی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ اگر اس معاملے میں حکومت غفلت یا بزدلی کا مظاہرہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ اس کی جواب دہ ہو گی۔ کسی موقع پر عوام یہ خیال کرتے ہوں کہ اب جہاد کرنا ضروری ہے تو انھیں چاہیے کہ وہ اپنی حکومت کو اس پر آمادہ کریں۔ اگر حکومت اس پر قائل ہو جائے تو اس کی اجازت سے اس کے تحت جہاد کریں۔ اس سے آگے بڑھ کر عوام کوئی اقدام کرنے کا حق رکھتے ہیں اور نہ اختیار۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی حکومت کی اطاعت کرے۔ الا یہ کہ وہ کسی خلاف دین کام کا حکم دے دے۔ البتہ اگر ان کی حکومت اجازت دے تو وہ ان مظلوم مسلمانوں کی اخلاقی اور مالی مدد کر سکتے ہیں۔

جہاں تک اس ضمن میں حکومتوں کا معاملہ ہے تو اس بارے میں وہی بہتر رائے قائم کر سکتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ انھیں ہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جنگی ساز و سامان کی نوعیت اور تعداد اور معاشی وسائل کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے۔ اگر کوئی حکومت ان حقائق کو نظر انداز کر کے کسی ملک کے ساتھ جنگ چھیڑ دے تو بڑا امکان ہے کہ دوسرے ملک کے مظلوم مسلمانوں کا مسئلہ تو حل نہیں ہو گا، بلکہ جنگ چھیڑنے والے ملک کے مسلمان بھی مظلوم بن کر رہ جائیں گے۔ مسلمانوں کی موجودہ ہر میدان میں پست حالت کے پیش نظر دین و دانش کی رو سے یہی اصولی بات کہی جا سکتی ہے کہ حکومتیں اس بات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں کہ کیا وہ اس قابل ہیں کہ جنگ کر کے مظلوم مسلمانوں کو ظلم سے نجات دلا سکیں اور ظالم ملک کو سبق سکھا سکیں؟ اگر اس کا جواب

ہاں میں ملے تو ضرور جہاد کریں۔ اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ سورۂ انفال کی آیت ۶۵ اور ۶۶ کی رو سے جہاد میں مسلمان نصرتِ خداوندی کی توقع اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب وہ دین پر پوری طرح عمل پیرا ہوں اور ان کی مادی قوت دشمن کی مادی قوت کے مقابلے میں ایک نسبت اور دو کی ہو۔ مثال کے طور پر مدِ مقابل کے پاس سو جہاز ہوں تو ویسے ہی پچاس جہاز مسلمانوں کے پاس ہونے چاہییں۔ مدمقابل کے پاس ایک ہزار ٹینک ہوں تو مسلمانوں کے پاس ویسے ہی پانچ سو ٹینک ہونے چاہییں۔ بصورت دیگر مظلوم مسلمانوں کو سیاسی طریقے سے ظلم سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ یہاں یہ مسلمانوں کی حکومتوں کو یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ظلم وعدوان خواہ کیسی ہی سنگین صورت اختیار کر لے، ان پر جہاد اسی وقت لازم ہو گا جب وہ مدمقابل کے مقابلے میں مذکورہ نسبت تناسب سے قوت کے حامل ہوں گے۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''.... ظلم وعدوان کا وجود متحقق بھی ہو تو جہاد اس وقت تک فرض نہیں ہوتا، جب تک دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کی حربی قوت ایک خاص حد تک نہ پہنچ جائے۔ سابقین اولین کے ساتھ دوسرے لوگوں کی شمولیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں دو کے مقابلے میں ایک مقرر کر دی تھی۔ بعد کے زمانوں میں یہ تو متصور نہیں ہو سکتا کہ یہ اس سے زیادہ ہو سکتی ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاد وقتال کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ اپنے اخلاقی وجود کو محکم رکھنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی حربی قوت بھی اس درجے تک لازماً بڑھائیں جس کا حکم قرآن نے زمانۂ رسالت کے مسلمانوں کو اس وقت کی صورتِ حال کے لحاظ سے دیا تھا:

''اور اِن کافروں کے لیے، جس حد تک ممکن ہو، حربی قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے اور تمھارے ان دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ اُن دوسروں پر بھی جنھیں تم نہیں جانتے، (لیکن) اللہ انھیں جانتا ہے اور (جان رکھو کہ) اللہ کی اِس راہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، وہ تمھیں پورا مل جائے گا اور تمھارے ساتھ کوئی کمی نہ ہو گی۔'' (الانفال ۸: ۶۰)'' (میزان ۲۵۰-۲۵۱)

www.javedahmadghamidi.org / www.al-mawrid.org

چیچنیا، فلسطین اور کشمیر کا مسئلہ

سوال: اس وقت چیچنیا پر روس ظلم کر رہا ہے، فلسطین پر اسرائیل ظلم کر رہا ہے، کشمیر پر بھارت ظلم کر رہا ہے، وہاں کے مسلمان جان ومال کی قربانی دے کر آزادی کی سعی وجہد کر رہے ہیں، ان کی یہ سعی وجہد جہاد ہے یا دہشت گردی؟

جواب: ہم آپ کے اس سوال کا جواب اصولی طور پر دیں گے تا کہ آپ اس جواب کی روشنی میں چیچنیا، کشمیر اور فلسطین

کے علاوہ دوسرے مقامات پر پائے جانے والے اس نوعیت کے مسائل کو بھی سمجھ سکیں اور یہ جان سکیں کہ مسلمان کہاں جہاد کر رہے ہیں اور کہاں جہاد نہیں کر رہے ہے۔ اسی طرح ہم اس بحث میں بھی نہیں پڑیں گے مسلمانوں کا کون سا عمل دہشت گردی ہے اور کون سا عمل دہشت گردی نہیں ہے۔ دہشت گردی کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے۔ البتہ ہمارے جواب سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کا کون سا عمل دین کے مطابق ہے اور کون سا عمل دین کے مطابق نہیں ہے۔ ہمارا کام بس اتنی بات کی وضاحت کرنا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بنیادی بات ذہن میں اچھی طرح راسخ کر لیں ہے کہ جہاد و قتال مسلمانوں کی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ مسلمانوں کو اس اصول کی کسی صورت میں خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ لہٰذا اگر کسی مقام پر مسلمانوں پر ظلم ہو اور ان کے اوپر غیر مسلموں کی حکومت ہو تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنا ایک قائد مقرر کریں اور اس کے تحت پر امن سیاسی طریقے سے اس ظلم کے خلاف جدوجہد کریں۔ دوسرے مسلم ممالک سے سیاسی مدد حاصل کریں۔ یا کسی آزاد علاقے میں اپنی حکومت قائم کریں اور پوری تیاری کے بعد ظالم حکومت کے خلاف جہاد کریں۔ اگر یہ سب کچھ کرنا ممکن نہ ہو تو وہاں مسلح جدوجہد کر کے اپنے آپ کو مزید مشکلات میں نہ ڈالیں اور سورہ اعراف کی آیت ۸۷ کی رو سے صبر سے کام لیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اگر کسی جگہ مسلمان محکوم ہوں، مگر انھیں اپنے دین و ایمان کے مطابق زندگی گزارنے کی پوری آزادی حاصل ہو تو انھیں سیاسی آزادی حاصل کرنے کا حق تو حاصل ہے، مگر دین ان پر اس کی کوشش لازم نہیں کرتا۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کا اسوہ اس کی واضح دلیل ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین پر رومیوں کا جابرانہ تسلط قائم تھا۔ رومیوں نے باہر سے حملہ کر کے بنی اسرائیل کی آزادی چھین لی تھی، مگر حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی قوم میں آزادی کی کوئی تحریک نہیں چلائی۔ انجیل (متیٰ باب ۲۲، ۱۵۔۲۲) میں ہے کہ ایک موقع پر بنی اسرائیل کے شر پسند افراد نے حکومت کے لوگوں کی موجودگی میں آپ علیہ السلام سے پوچھا کہ قیصر (حکمران) کو جزیہ دینا درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔

جہاں تک اس صورت حال کا تعلق ہے کہ کسی جگہ پر مسلمانوں کی اپنی حکومت ہو اور کوئی دوسرا ملک ان پر ظلم کر رہا ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ اس صورت میں ان کی حکومت کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ آیا وہ جہاد کے ذریعے سے مسئلہ حل کرنے کے قابل ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہو اور دوسرے مسلم ممالک بھی اس پوزیشن میں نہ ہوں تو جذباتیت کے بجائے عقل سے کام لے، حقائق کے مطابق رائے قائم کرے، اپنے تنازع کے آئیڈیل حل کے بجائے ممکن حل کی طرف بڑھے، کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی پر عمل کرے یا اس تنازع کو سرد خانے میں ڈال کر مخالف ملک کے ساتھ اپنے تعلقات نارمل کرنے کی کوشش کرے اور اپنی تمام تر توانائیوں کا رخ اپنی تعمیر کی طرف کر دے۔ اپنے آپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے ملک کو دینی، اخلاقی، علمی، سیاسی، معاشی غرض یہ کہ ہر پہلو سے مضبوط بنائے اور عوام اپنی حکومت کا ہر طرح ساتھ دیں، کیونکہ ایسے معاملات میں کمزوری ہی کے باعث

ان پر کوئی ملک ظلم کرنے کی جرأت کر رہا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے شریعت، حکمت اور حقیقت پر مبنی اس روش کو اختیار نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ ان پر ظلم کا سلسلہ جاری رہے گا اور ان کے مسائل میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔

جہاد ـــــ چند متفرق مسائل

سوال: آپ کا رسالہ ''اشراق'' اتفاقاً چند بار پڑھا۔ آپ پر اور مولانا وحید الدین صاحب پر مختلف مذہبی حضرات کی تنقید کو ایک طرف کر کے میں ذاتی طور پر یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں:

۱۔ (نہایت معذرت کے ساتھ) آپ کو مخصوص لابی سے فنڈ ملتا ہے جس کے ساتھ وفاداری نبھاتے ہوئے آپ دلائل کے ذریعے سے مسلمانوں کو ہر جرم میں قصوروار اور اغیار کو پر کشش بنا رہے ہیں تاکہ جذبۂ جہاد کا خاتمہ ہو سکے۔

۲۔ آپ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کہ اندروہ خامیاں ختم ہو جائیں جو ان کی شکست کا باعث بنتی ہیں۔ (اللہ کرے آپ کی سوچ ایسی ہو)۔

جناب محترم دوسری بات کی طرف آنا چاہوں گا۔ آپ جو دلائل دے رہے ہیں، وہی دلائل سیکولر افراد اور اہل کفر کی زبان سے مسلمانوں کی مخالفت والے پلڑے میں ڈالے جاتے ہیں۔ اس سے ترازو کا جھکاؤ کس طرف ہوگا؟ ممکن ہے آپ اصلاح چاہتے ہوں لیکن یقین کیجیے آپ کے دلائل مسلمانوں کے زخموں پر مرہم پٹی کے بجائے لال مرچ کے بیج کا کام دے رہے ہیں۔ آپ ضد میں آکر کبھی اتنے نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ دکھ ہوتا ہے۔ مفتی اعظم سعودی عرب اور امام کعبہ کہتے ہیں کہ کشمیری مظلوم ہیں، ان کی ہر طرح سے مدد کریں اور جہاد کشمیر صحیح جہاد ہے۔ مگر آپ نے اسے پرائیوٹ جہاد کا نام دے کر دشمنوں کو خوش کر دیا۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک کے قیام کے وقت کوئی شرعی حکومت آرڈر دینے والی نہ تھی۔ کیا اس وقت جن لوگوں نے قربانیاں دیں، پرائیویٹ جہاد تھا؟ اس کی کوئی دینی حیثیت نہ تھی؟ خدارا یہ سرٹیفیکیٹ آپ نہ دیں، یہ اللہ تعالیٰ ہی دے گا جس کی خوش نودی کے لیے لوگ جان ہتھیلی پر رکھتے ہیں۔

جواب: آپ نے ہمارے کاموں کا جو پہلا مقصد متعین کیا ہے، اسے پڑھ کر ہمیں افسوس تو ہوا، مگر حیرت نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری مذہبی دنیا میں عام آدمی تو درکنار علما اور پیشوا بھی دوسرے لوگوں کے کام کی نوعیت کے بجائے ان کی نیت میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، پھر ٹھوس شواہد حاصل کیے بغیر، دوسرے سے وضاحت حاصل کیے بغیر، حتیٰ کہ دوسرے کے ساتھ معمولی قسم کا مکالمہ کیے بغیر منفی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اگرچہ دین کی رو سے یہ رویہ بدگمانی کے ذیل میں آتا ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بہت سے گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان صریح گناہ ہوتے ہیں اور ٹوہ میں نہ لگو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مسلمان کو اپنے دوسرے بھائیوں سے حسن ظن رکھنا چاہیے۔ اگر کسی سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو بدگمانی پیدا کرنے والی ہو تو وہ حتی الامکان اس کی اچھی توجیہہ کرنی چاہیے، اگر اچھی توجیہہ نکل سکتی ہو۔ اس کے منفی پہلو کو اسی صورت میں اختیار کرنا جائز ہے جب اس کی کوئی اچھی توجیہہ نہ نکل سکے۔

مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں بدگمانی کی روش بہت عام ہے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی طبقات میں منافرت، دشمنی اور خوں ریزی کی ایک وجہ یہ روش بھی ہے۔

بدگمانی کس قدر سنگین اخلاقی جرم ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے جنگ میں لڑتے ہوئے ایک غیر مسلم پر پوری طرح قابو پا لیا تو اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا، اس کے باوجود صحابی نے اسے قتل کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی سے دریافت فرمایا کہ جب اس نے کلمہ پڑھ لیا تھا تو اسے کیوں قتل کیا؟ صحابی نے کہا کہ اس نے موت کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ یہ بات سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا۔

ہمارے کام کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی خامیاں ختم ہوں۔ وہ آخرت میں سرخرو ہوں اور دنیا میں بھی باوقار مقام حاصل کریں۔ ہمارے اس مقصد کے پیچھے رضاے الٰہی کے حصول کے سوا ہرگز کوئی محرک کارفرما نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہم مسلمانوں پر اس لیے تنقید کرتے ہیں کہ مسلمان ہمارا مسئلہ ہیں، ہمیں ان کے ساتھ ہمدردی ہے، ہم ان کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اگر ہم کبھی اغیار کی تحسین کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اغیار میں کچھ ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن سے ہم محروم ہیں۔ ایک مسلمان کسی معاملے میں جب مختلف اقوام کا تجزیہ کرتا ہے تو اسے حقائق کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے۔ حتیٰ کہ دشمن قوم میں بھی جو خوبی دکھائی دے گی اس کا اعتراف کرنا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

''ایمان والو، عدل پر قائم رہنے والے بنو۔ اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس طرح نہ ابھارے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔'' (۵:۸)

اسی طرح سورۂ نساء میں ہے:

''ایمان والو، انصاف پر قائم رہنے والے بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگرچہ اس کی زد خود تمھاری اپنی ذات، تمھارے والدین اور تمھارے اقربا ہی پر پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کے لیے احق ہے۔ اس لیے تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر اسے بگاڑو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔'' (۴:۱۳۵)

آپ معاشرتی معاملات میں قطار بنانے کے مسئلے ہی کو لیجیے، ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں، ایک پہلو سے دیکھیں تو نماز انسان کو ڈسپلن بھی سکھاتی ہے، مگر ہم مسلمان نماز سے یہ سبق حاصل نہیں کرتے، ہم عملی زندگی میں انتہائی غیر منظّم لوگ ہیں، بسوں میں سوار ہوتے وقت، ڈاک خانے میں کوئی معاملہ کرتے وقت، حتیٰ کہ بیت اللہ میں حجر اسود کو بوسہ دیتے وقت کبھی قطار بنانا پسند نہیں کرتے۔ جبکہ مغربی اقوام اس معاملے میں اس قدر ڈسپلن کا مظاہرہ کرتی ہیں کہ ان کے بارے میں یہ لطیفہ بن گیا ہے کہ انگریز کہیں اکیلا بھی کھڑا ہو تو قطار بنا لیتا ہے۔ اس حوالے سے اگر ہم مسلمانوں پر تنقید کریں اور انھیں شرم دلانے کے لیے انگریزوں کی اس خوبی کا حوالہ دے دیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ یہ بھی اصلاح احوال کا ایک طریقہ ہے۔ اس میں بھی درحقیقت قومی درد ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔

اغیار کے مسئلے کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیے۔ یہ اغیار آخر کون ہیں؟ یہ سب آدم علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں۔ یہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ کچھ تعصّبات کی وجہ سے یہ ایک دوسرے کے لیے غیر بن گئے ہیں۔ یہ تمام ''غیر'' ہم مسلمانوں کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم مسلمان ہی انھیں حیات و کائنات کے حقائق سے آگاہ کر سکتے ہیں۔ اپنی اس حیثیت اور اہمیت کے پیش نظر ہمیں اپنے مفادات کی فہرست میں دعوتی مفاد کو سر فہرست رکھنا چاہیے۔ دعوت کے کام کے لیے ضروری ہے کہ ایسی غیریت کی بے جا دیواروں کو ہم خود گرا دیں۔ اس میں ہمارا ہی مفاد پوشیدہ ہے۔ غیریت کا احساس کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف کیا جائے۔ اس سے قربت پیدا ہوگی، ملنے جلنے کا ماحول بنے گا اور اسی سے اپنی بات ان تک پہنچانے کا موقع پیدا ہوگا۔ اگر ہم اپنے اور غیر مسلم اقوام کے مابین بے جا فاصلوں میں اضافہ ہی کرتے رہیں گے تو ان تک ان کی اس امانت کو کیسے پہنچائیں گے جو اسلام کے نام سے ہمارے پاس موجود ہے۔

مسلمانوں پر تنقید کرتے ہوئے ہم کبھی نازیبا الفاظ استعمال نہیں کرتے، اگر آپ کہیں ایسے الفاظ یا ایسا اسلوب پائیں تو از راہ کرم اس کی نشان دہی کریں ہم اس پر معذرت بھی کریں گے اور اپنی اصلاح بھی۔ لیکن اس معاملے میں آپ کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے اوپر تنقید سن کر کوئی بھی انسان خوش نہیں ہوتا۔ وہ تنقید کو بالعموم منفی مفہوم میں لیتا ہے۔ وہ ناقد کو اپنا مخالف، بلکہ دشمن خیال کرتا ہے۔ حالانکہ تنقید ایک مثبت چیز ہے۔ ہاں نکتہ چینی منفی چیز ہے۔ تنقید سے تو مسائل کے مخفی پہلو اجاگر ہوتے ہیں، حقائق نکھرتے ہیں، جس سے دوسرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ آپ تمام انبیاے کرام کے کام پر غور کریں، آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنی قوم پر کس قدر سخت تنقید کرتے تھے۔ سمجھ دار لوگ اس تنقید کو مثبت مفہوم میں لیتے تھے اور اپنی اصلاح کرتے تھے، جبکہ دوسری قسم کے لوگ تنقید کو منفی مفہوم میں لیتے، وہ تنقید سن کر غصے میں آجاتے، نبی کی دشمنی پر اتر آتے اور یوں اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق قرار پاتے تھے۔

اب وحی والہام کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اہل علم اپنے دینی فہم کے مطابق بڑے خلوص کے ساتھ دوسروں پر تنقید کرتے ہیں جو درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ لہٰذا ہر تنقید کو مثبت مفہوم میں لینا چاہیے، ناقد پر اخلاقی الزام عائد کرنے کے بجائے

غیر جذباتی ہو کر اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، بات واضح نہ ہو تو اس کے ساتھ تہذیب اور دلیل کے ساتھ مکالمہ کرنا چاہیے۔اس سے ایک تو ماحول میں تناؤ پیدا نہیں ہوگا اور دوسرے یہ کہ فریقین میں سے کسی ایک کی غلط فہمی دور ہو جائے گی اور وہ درست رائے اختیار کر لے گا۔درست رائے ہی سے انسان درست رویہ اختیار کرتا ہے۔افراد کے درست رویوں ہی سے قومی سطح پر درست پالیسیاں تشکیل دی جاتی ہیں جو قومی تعمیر میں غیر معمولی کردار ادا کرتی ہیں۔

جہاں تک کشمیریوں کے مظلوم ہونے کی بات ہے،اس سے کون انکار کرتا ہے،اس دردناک حقیقت کا ہم نے کئی دفعہ اظہار کیا ہے۔اسی پہلو سے''اشراق'' میں استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی''وادی کشمیر'' کے نام سے ایک نظم بھی شائع ہو چکی ہے۔ہم تو سمجھتے ہیں کہ کشمیریوں پر نہ صرف یہ کہ غیر مسلم ظلم کر رہے ہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے بھی ظلم کا شکار ہیں۔اور اس ظلم کا دائرہ آزاد کشمیر اور پاکستان کے مسلمانوں تک پھیل چکا ہے۔اگر آپ اس پہلو سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی پالیسیوں کی وجہ سے کشمیریوں کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔مسلمانوں کے مسلح گروہ بھارتی فوج کے خلاف کوئی کارروائی کر کے جنگلوں میں چھپ جاتے ہیں اور پھر بھارتی فوج پرامن کشمیریوں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔نوجوان مسلمانوں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے،ان پر ظلم کیا جاتا ہے،بعض کو قتل کر دیا جاتا ہے اور عورتوں کی عصمت پامال کر دی جاتی ہے۔اس کے علاوہ بھارتی حکومت اس پر یہ موقف اختیار کرتی ہے کہ ایسی مسلح کارروائیوں کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہے۔ادھر پاکستان میں بھی بعض مذہبی جماعتیں بڑے فخر کے ساتھ علانیہ ایسی کارروائیوں کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔وہ مذہبی جماعتیں ایسی کارروائیوں کو جہاد کا نام دیتی ہیں۔مگر دنیا تو اپنے انداز سے سوچتی ہے۔اس کی نظر میں ایسی کارروائیاں سرحد پار دہشت گردی (Cross Border Terriorism) قرار پاتی ہیں۔اس سے دنیا بھر میں پاکستان کی بدنامی ہوتی ہے۔مسلمانوں کا تاثر خراب ہوتا ہے۔دنیا میں پاکستان اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔پاکستان پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں جس سے حکومت پاکستان مالی مسائل کا شکار ہوتی ہے اور جن کا حل وہ عوام پر مزید ٹیکس لگا کر اور چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ کر کے نکالتی ہے۔اس صورت حال سے مزید مسائل پیدا ہوتے ہیں۔پاکستان اور بھارت کے درمیان تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔کنٹرول لائن پر پاکستانی اور بھارتی افواج کے مابین جھڑپیں شروع ہو جاتی ہیں،جس سے آزاد کشمیر میں کنٹرول لائن کے قریب رہنے والے مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔بعض تو زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔اس کے علاوہ دونوں ملکوں کی فوجیں بار بار ریڈ الرٹ ہوتی ہیں۔افواج کی نقل و حرکت،اسلحے کی تیاری اور نئے اسلحے کی خریداری پر غیر معمولی سرمایہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔بھارت چونکہ بہت بڑا ملک ہے اس لیے اس کے مقابلے میں ہمیں بہت بڑی فوج رکھنی پڑتی ہے۔ان تمام معاملات کے لیے بھی عوام ہی کا خون نچوڑا جاتا ہے۔پھر کمزور قسم کے لوگ زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں جس سے شریف النفس افراد کی مصیبتوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ان اہل علم کا تعلق ہے جو''پرائیویٹ جہاد'' کو شرعاً درست قرار دے رہے ہیں تو یہ ان کی رائے ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انھیں کسی بھی معاملے میں اپنی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے، مگر ہمیں ان کے ساتھ اتفاق نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تمام انبیا و رسل کے اسوہ سے بالکل واضح ہے کہ جہاد ہمیشہ علانیہ اور حکومت کے تحت ہوتا ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حیا اور حجاب

[مدیر ''اشراق'' سے روزنامہ ''پاکستان'' کے لیے ایک انٹرویو]

سوال: آج کل بعض حلقوں بالخصوص مذہبی حلقوں کی طرف سے ہمارے ذرائع ابلاغ خصوصاً ٹیلی وژن کا قبلہ درست کرنے کی بات بڑی شدت سے سننے میں آ رہی ہے۔ آپ کی نظر میں ٹیلی وژن کا کردار کیا ہونا چاہیے؟

جواب: اس ضمن میں سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ذرائع ابلاغ کے حوالے سے ریاست کا کیا کردار ہونا چاہیے؟ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ریاست کو ٹیلی وژن اور ریڈیو دونوں میں نیوز اور ویوز تک محدود رہنا چاہیے۔ تفریح کے لیے ان ذرائع کا استعمال پرائیویٹ سیکٹر کو منتقل کر دینا چاہیے۔ ریاست پورے معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے تمام ذرائع معاشرے کی تعمیر کرنے، اسے تعلیم یافتہ بنانے اور اس کے شعور کو بہتر کرنے کے لیے استعمال کرنے چاہییں۔ پرائیویٹ سیکٹر کو جب آپ ریڈیو، ٹیلی وژن کے چینلز قائم کرنے کی اجازت دیں گے تو اپنی تہذیبی اور معاشرتی روایات اور اخلاقی کردار کے لحاظ سے انھیں بعض حدود کا پابند بھی کریں گے۔ میرے خیال میں یہ حدود اسی قدر نافذ ہوں گے، جس قدر بحیثیت مجموعی معاشرے کا شعور بہتر ہو گا۔ قانون کی طاقت سے آپ صرف چند مجرمانہ سرگرمیوں کو کنٹرول کر سکتے ہیں، اخلاقی اقدار کی ترویج نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ریاست کو بھی تعلیم، ترغیب اور تلقین کے طریقے اپنانے چاہییں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہمارے معاشرے میں اس وقت تہذیبی روایات دم توڑ رہی ہیں، اخلاقی اقدار کا شعور دھندلاتا جا رہا ہے۔ سوسائٹی بحیثیت مجموعی ان چیزوں کی قدر و قیمت سے ناواقف ہو گئی ہے۔ اس میں اگر کوئی چیز قانون کی قوت سے نافذ کی جائے تو بتدریج اپنا اثر کھو بیٹھے گی۔

سوال: جب ریاست ٹیلی وژن پر نیوز اور ویوز کو اپنے کنٹرول میں رکھے گی تو پھر عوام تک اصل خبر کیسے پہنچے گی؟

جواب: کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ ریاست کو نیوز اور ویوز اپنے کنٹرول میں رکھنے چاہییں، بلکہ اس کا دائرہ یہاں تک ہی ہونا چاہیے۔ البتہ پرائیویٹ سیکٹر جس طرح چاہے نیوز اور ویوز کے لیے چینلز قائم کرے جیسے سی این این اور بی بی سی ہیں۔ میرے نزدیک جس قدر جلد ممکن ہو، یہ پرائیویٹ چینلز قائم کرنے کے حالات پیدا کیے جائیں۔

سوال: ڈش اور کیبل کے ذریعے سے جو فحاشی گھر گھر داخل ہو چکی ہے، کیا اسے قانون کی طاقت سے روکنا درست قدم ہوگا؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ اس طریقے سے یہ سلسلہ رکے گا نہیں اور اگر کسی طرح روک تھام ممکن بھی ہو تب بھی اس طرح کی چیزوں کو قانون کی طاقت سے نہیں روکنا چاہیے۔

سوال: مگر ہمارا مذہبی طبقہ اس ضمن میں سوسائٹی کی اصلاح کے لیے صرف ایک ہی طریقے پر زور دیتا ہے کہ حکومت قانون کی طاقت سے صورت حال کو کنٹرول کرے؟

جواب: میرے خیال میں اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنی پوری سوسائٹی کو تعلیم یافتہ بنائیں تاکہ وہ خود اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکے۔ وہ زمانہ گزر گیا ہے جب آپ پابندیاں لگا کر معاشرے کو درست کر سکتے تھے۔ جس طرح آپ سگریٹ نوشی کے نقصانات کے بارے میں رہنمائی کرتے ہیں۔ اور پھر جب بہت تھوڑے لوگ اس کا ارتکاب کرنے والے رہ جاتے ہیں تو پابندی لگاتے ہیں۔ یہ پابندی بھی آپ پبلک مقامات تک لگا سکتے ہیں۔ گھروں میں اگر لوگوں کا شعور بہتر نہیں کیا گیا، ان کی اخلاقی حس بیدار نہیں کی گئی تو وہ ہزار چور دروازے نکال لیں گے۔ معاشرے کی تعمیر کا بہترین طریقہ تین نکات پر مشتمل ہے:

اول، معاشرے کا تعلیمی معیار بہتر کیا جائے۔

دوم، تعلیم کی روشنی میں تربیت کا اہتمام کیا جائے۔

سوم، سوسائٹی کے بڑے لوگ ضبط نفس کا مظاہرہ کریں اور اخلاقی اقدار کا نمونہ پیش کریں۔

سوسائٹی کی تعمیر اسی طرح ہو سکے گی نہ کہ قانون کی پابندیوں سے۔ ڈش اور کیبل خود کوئی پروگرام نشر نہیں کرتے، آدمی ہی اسے استعمال میں لاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو آدمی بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا مذہبی طبقہ سوسائٹی کی اصلاح کے صرف ایک ہی طریقہ پر زور دیتا ہے کہ حکومت قانون نافذ کرے۔ جب کہ سوسائٹی کا علم رکھنے والے لوگ یہ جانتے ہیں کہ قانون کے نفاذ سے اسی صورت میں فائدہ ہوتا ہے جب سوسائٹی کی بڑی تعداد تعلیم و تربیت کے ذریعے سے درست کر دی جائے۔

سوال: پورنوگرافی اور بلیو فلمیں جس طرح سے ناپختہ ذہنوں کو ناکارہ بنا رہی ہیں، کیا ان پر پابندی کے علاوہ کوئی اور طریقۂ کار موثر ہو سکتا ہے؟

جواب: بات یہ ہے کہ آپ اپنی صلاحیت اور قوت کا ۹۰ فی صد حصہ تعلیم، تربیت اور اچھا نمونہ پیش کر کے لوگوں میں اخلاقی شعور بیدار کرنے میں خرچ کریں۔ اس کے بعد جہاں کہیں واضح اور مجرمانہ انحراف سامنے آئے، وہاں پابندی بھی لگا دیں۔ پابندی اگر اتنی ہی حدود میں لگائی جائے تو موثر ہوتی ہے۔ اب کسی کو بلیو فلم بازار سے لا کر چلانے کی ضرورت نہیں، انٹرنیٹ پر سب کچھ میسر ہے، آپ کہاں کہاں پابندی لگائیں گے۔ میرے نزدیک قانون کا استعمال انتہائی محدود اور پبلک

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مقامات پر ہونا چاہیے۔انفرادی زندگی کی اصلاح کا واحد راستہ تعلیم وتربیت اور بڑے لوگوں کی طرف سے ضبط نفس کا مظاہرہ ہے۔ بڑے لوگوں سے مراد سوسائٹی کے وہ لوگ ہیں جن کو کوئی حیثیت حاصل ہوتی ہے، خواہ وہ سیاسی لحاظ سے ہو، خواہ معاشرتی ہو، خواہ علمی لحاظ سے ہو۔ان کا نمونہ سامنے رہنا چاہیے اوران کو مسلمان سوسائٹی کی تربیت کرنی چاہیے۔خلفاے راشدین نے تو شاید ہی کسی چیز پر قانونی پابندی لگائی ہو،تعلیم وتربیت اور سیاسی رہنماؤں کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط سے معاشرہ کو درست کیا۔میرے نزدیک پابندی سے کہیں کوئی مسئلہ آج تک نہ حل ہوا ہے اور نہ حل ہونے کا کوئی امکان ہے۔

سوال: ہمارے ہاں طوائف جس طرح کوٹھے سے نکل کر سڑک پر آ گئی ہے۔ایک تاثر یہ ہے کہ اگر اسے سختی سے نہ روکا گیا تو یہ ہر گھر کے دروازے پر کھڑی ہوگی۔آپ کے خیال میں ایک عورت کیوں کر طوائف بنتی ہے اور اسے کیسے اس غلاظت سے نکالا جا سکتا ہے؟

جواب: اس کا بھی سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں ہے کہ پہلے ان عوامل کو دور کیا جائے جو طوائف بننے کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے بعد بہت معمولی انحراف رہ جائے گا۔ اس کے عوامل سیاسی، سماجی اور معاشی ہیں۔طوائف کے کلچر پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔اگر آپ اس کا مطالعہ کریں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ اپنی آزادانہ مرضی سے یہ راستہ اختیار کرنے والی عورتیں ایک فی کروڑ بھی نہ ہوں گی۔سوسائٹی کے ظلم طوائف کو جنم دیتے ہیں۔

سوال: کیا آپ طوائف بننے کے سیاسی عوامل کی کچھ وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟

جواب: سیاسی عوامل اصل میں سماجی عوامل کے بل پر کھڑے ہوتے ہیں۔ برصغیر کی سیاست کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ نوے فی صد جاگیردارانہ سماج سے پیدا ہوتی ہے۔اقتدار اس کو جاگیرداری دیتی ہے۔ پھر اس اقتدار کو سیاسی عمل سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ چیز سوسائٹی کے پسے ہوئے طبقات پر ظلم کی قوت کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ جب کسی اچھی شکل و صورت کی لڑکی کی عزت کسی گاؤں میں محفوظ نہ رہے۔ بے شمار خواتین بے ہودہ رسوم کی بھینٹ چڑھا دی جائیں۔عزت اور غیرت کے تصورات مصنوعی اور حقائق سے ماورا ہوں تو طوائف جنم لیتی رہتی ہے۔ان عوامل کو دور کیے بغیر اس کی اصلاح ممکن نہیں۔

سوال: مگر طوائف کے سڑک پر آنے سے جو خرابیاں جنم لے رہی ہیں، کیا اس صورت حال کا فوری ازالہ ضروری نہیں؟

جواب: اصل چیز اس کے سڑک پر آنے کو روکنا نہیں، بلکہ اس کے پیچھے اس آنے دو کے عمل کو روکنا ہے۔ جب آپ اسے روک دیں گے تو پھر اس کو قانون کی طاقت سے روکا جا سکتا ہے۔ایسے کبھی نہیں ہوتا کہ بند باندھ دینے سے سیلاب رک جائے، جب تک آپ پانی کے منبع کو کنٹرول نہیں کریں گے، سیلاب آتا رہے گا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں اتنی زیادہ مذہبی تنظیمیں ہیں کیا کبھی کسی تنظیم نے کوئی ایسا سیل بنایا کہ جو مطالعہ کرے کہ طوائف کیوں جنم لے رہی ہے؟ کوئی عورت آسانی کے ساتھ اپنا گھر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ ہر طوائف کو معلوم ہوتا

ہے کہ اس کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں۔ اس کے بعد اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔ اگر ہم ان عوامل کو درست کریں اور اس کے بعد قانون کا استعمال کریں تو اس سے بہتری پیدا ہوگی۔

سوال: غامدی صاحب! اسلام میں پردے کا کیا تصور ہے؟ کیا خواتین کے لیے چہرہ ڈھانپنا ضروری ہے؟

جواب: میں پردے کا لفظ مناسب نہیں سمجھتا۔ میری تحقیق کے مطابق اسلام میں مرد و عورت کے ملنے کے آداب بتائے گئے ہیں اور یہی تعبیر میں ان احکام کے لیے موزوں سمجھتا ہوں جو اس سلسلے میں قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر تین باتیں ہیں:

اول، یہ کہ مرد اور عورت اپنی نگاہوں میں حیا رکھیں۔

دوم، ان اعضا کو نمایاں نہ کریں جو صنفی کشش کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کی جائے۔

اور سوم، یہ کہ عورتیں اپنی زیب و زینت کی نمایش نہ کریں اور اپنے سینے ڈھانپ کر رکھیں۔

سوال: کیا یہ مستند حدیث آپ کی نظر سے نہیں گزری جب ام سلمہ اور حضرت میمونہ نے نابینا صحابی ابن المکتوم سے پردہ نہ کیا تو حضور اکرم نے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ ابن المکتوم نابینا ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر وہ نابینا ہے تو کیا ہوا تم تو اسے دیکھ رہی ہو۔ اس حدیث سے عورت کے پردے کے حوالے سے کیا تاثر ملتا ہے؟

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے بارے میں قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے ایسی فضا پیدا کر رکھی تھی کہ کسی نہ کسی اسکینڈل کا راستہ تلاش کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید نے بعض خاص ہدایات انھی کے بارے میں دی ہیں تاکہ اس طرح کے اسکینڈل بنانے کی خواہش رکھنے والوں کا سدباب کیا جائے۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ قریبی عزیزوں کے علاوہ باقی لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جانے سے روک دیا گیا اور ازواج مطہرات کو بھی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس معاملے میں غیر معمولی احتیاط روا رکھیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کو مسلمانوں کی مائیں قرار دیا اور ان کے ساتھ نکاح ممنوع قرار دیا ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ سماجی زندگی میں سرگرم ہونے کے بجائے اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ گھر کے ساتھ مسجد نبوی میں بیٹھنے والوں کو پابند کر دیا گیا کہ وہ براہ راست گھر میں داخل نہ ہوں۔ لوگ اس خاص صورت حال کا فرق نہیں سمجھتے، اس وجہ سے بہت سے واقعات سے غلط استدلال کرتے ہیں۔

سوال: ایک روایت یہ بھی سننے میں آتی ہے کہ اگر مرد کی کسی عورت پر نظر پڑ جائے تو پہلی نظر قابل معافی ہے۔ بعض من چلے اس روایت کو بنیاد بنا کر پہلی نظر کو ہی طویل کر لیتے ہیں۔ عورت پر پہلی نظر کس حد تک قابل معافی ہے؟

جواب: اصل میں کہا گیا ہے کہ ایک نظر وہ ہے جو ضرورتاً پڑتی ہے اور ایک نظر وہ ہے جو حسن و جمال کا جائزہ لینے کے لیے پڑتی ہے تو یہ مسلمانوں کو اس دوسری نظر کے معاملے میں محتاط رہنا چاہیے۔ یہ احتیاط اس کے دل کی پاکیزگی کا باعث بنتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سوال: ہمارے ہاں بعض مذہبی شخصیات جو پردے کی سختی سے قائل ہیں، ان کے گھر میں چوکی دار، خانساماں، ڈرائیور وغیرہ جو مرد ملازم ہوتے ہیں، ان سے پردہ نہیں کیا جاتا، جبکہ دوسرے مردوں سے سختی سے پردہ کیا جاتا ہے، کیا یہ لوگ ''مرد'' شمار نہیں ہوتے؟

جواب: جب آپ کوئی خلاف فطرت اور انتہا پسندانہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو آدمی کو اس پر عمل میں ایسی ہی شکست ہوتی ہے، پھر وہ اپنا بھرم بھی قائم رکھتا ہے اور چور دروازے بھی تلاش کر لیتا ہے۔

سوال: ہمارے ہاں بعض خواتین سر پر دوپٹے کا بڑی سختی سے خیال رکھتی ہیں، جبکہ بعض خواتین بالکل خیال نہیں رکھتی۔ دوپٹے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: اصل میں ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کی تہذیب اور ثقافت کیا ہے اور انھیں کن حدود کا پابند رہ کر زندگی بسر کرنی چاہیے۔ دوپٹا ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں۔ البتہ اسے ایک تہذیبی شعار کے طور پر ضرور پیش کرنا چاہیے۔ اصل چیز سینہ ڈھانپنا اور زیب و زینت کی نمایش نہ کرنا ہے۔ یہ مقصد کسی اور ذریعے سے حاصل ہو جائے تو کافی ہے۔ اس کے لیے دوپٹا ہی ضروری نہیں ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خواب

[مدیر ''اشراق'' سے روزنامہ ''پاکستان'' کے لیے ایک انٹرویو]

ہم میں سے ہر کوئی خواب دیکھتا ہے کبھی بہت اچھا اور کبھی بہت برا۔ خواب اچھا ہو یا برا، ہر کوئی اس کی تعبیر جاننے کی خواہش ضرور رکھتا ہے۔ کبھی کبھی لوگ کسی عالم یا دانا شخص سے بھی اس بارے میں رجوع کرتے ہیں۔ میں کئی ایسے افراد کو جانتا ہوں، جنھوں نے خواب کی تعبیر کا ایک طریقہ کار وضع کر رکھا ہے اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ تعبیر کرتے چلے جاتے ہیں خواہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ بچپن میں، میں جب ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کے لیے سوہدرہ اپنے محلے کی جامع مسجد اہل حدیث ملکاں والی جایا کرتا تھا تو ایک روز صبح ایک صاحب جو میرے عزیز دوست بشیر ملک جھنگے شاہی کے سگے بھائی تھے۔ مسجد میں تشریف لائے اور مولوی صاحب سے کہنے لگے کہ میں نے آپ سے علیحدگی میں کوئی بات کرنی ہے۔ مولوی صاحب نے پوچھا: خیریت تو ہے؟ جواب دیا: میں نے رات کو ایک خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر جاننا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب فرمانے لگے کہ کوئی بات نہیں، آپ بچوں کے سامنے خواب بیان کر دیں۔ انھوں نے خواب کی تفصیل بتائی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے رات کو خواب میں ایک بلی کو مار دیا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ یہ خواب اچھا نہیں ہے، آپ اس کا کسی سے ذکر مت کریں، البتہ جس قدر جلد ممکن ہو صدقہ دیں، مگر میں نے دیکھا کہ اس واقعہ کے دو چار دن بعد وہ صاحب انتقال کر گئے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد بچپن سے لے کر اب تک میرے ذہن میں خواب کی بڑی واضح اہمیت موجود رہی ہے۔ بہت سے احباب سے خواب کے مختلف پہلوؤں پر بات بھی ہوئی، مگر دل مطمئن نہ ہوا۔ کبھی ایسا ہوا کہ میں نے جو خواب دیکھا، وہ سو فی صد درست ثابت ہوا۔ اور کئی بار خواب کے نتائج سو فی صد الٹ نکلے۔ اس حوالے سے میں الجھن کا شکار رہا کہ خواب کے بالکل درست اور کبھی بالکل غلط ثابت ہونے کی اصل وجہ کیا ہے؟

پچھلے دنوں جاوید احمد صاحب غامدی سے خواب کے موضوع پر مکالمہ ہوا تو یوں محسوس ہوا کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے ہم

لوگ اسے کچھ اور رنگ دیتے ہیں۔ چونکہ ہم سب بہت سے خواب دیکھ چکے ہیں اور آیندہ بھی دیکھیں گے، اس لیے اس کالم کا بنظر عمیق مطالعہ بہت مفید رہے گا۔

میرا ان سے پہلا سوال یہ تھا کہ کسی چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے انسان کی آنکھوں اور شعور کا ہونا ضروری ہوتا ہے، مگر خواب میں آنکھیں اور شعور دونوں کام نہیں کرتے۔ پھر بھی وہ ہر چیز کو بڑا واضح دیکھ اور سمجھ رہا ہوتا ہے۔ آپ کی نظر میں خواب ہے کیا چیز؟

جاوید احمد غامدی گویا ہوئے:

خواب کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے بارے میں علم نفسیات کے ماہرین نے جو کچھ تحقیقات کی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ہمارے لاشعور کی یادیں خواب میں نمایاں ہو جاتی ہیں اور شعور اور لاشعور باہمی مکالمہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ انسان کی امیدیں اور خواہشات ممثل ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔ شیاطین جن انسان کے لاشعور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے اثرات انسان خواب میں محسوس کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے تمثیلی اسلوب میں مستقبل کے متعلق کوئی اچھی خبر اس تک پہنچا دیتے ہیں۔ انبیا کا خواب خدا کی وحی ہوتا ہے اور بارہا انھیں خواب ہی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہدایات دیتے ہیں یا زمین و آسمان میں اپنی نشانیاں دکھاتے ہیں۔ خواب کی یہ چند صورتیں ہیں، تمام صورتوں کا احاطہ ابھی تک ماہرین نفسیات کے لیے ممکن نہیں ہو سکا۔

سوال: کبھی کبھار انسان بہت ڈراؤنا خواب دیکھتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہوتی ہے اور ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: ڈراؤنے خواب کے متعدد وجوہ ہو سکتے ہیں۔ یہ انسانی جسم میں کسی بیماری یا اختلال کے باعث بھی آ سکتا ہے، نفسیاتی عوارض بھی اس کا باعث ہو سکتے ہیں اور شیاطین جن کی دراندازی سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ جسمانی اور نفسیاتی عوارض ہوں تو ان کا علاج کرنا چاہیے اور شیاطین جن کی دراندازی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اس کے لیے ہم مسلمانوں کو اللہ اور رسول نے نہایت عمدہ دعائیں سکھائی ہیں۔ علاج کے ساتھ ان دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

سوال: بعض لوگ اس بات پر بڑا زور دیتے ہیں کہ برا خواب آنے کی صورت میں اس کا کسی کے سامنے ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ یہ فوری طور پر درست ثابت ہو جاتا ہے۔ کیا واقعی کوئی ایسی بات ہے؟

جواب: یہ محض توہمات ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ خواب بتانا نہ بتانا آدمی کی صواب دید پر منحصر ہے۔ بعض اوقات دوسروں سے اپنے ساتھ کسی واردات کا مکالمہ کر لینا باعث اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ خواب دیکھنے والے کو کرنا چاہیے کہ وہ خود ہی اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے یا اسے اس طرح کے کسی مکالمے کی ضرورت ہے۔ مذہب میں نہ اس کی تلقین کی گئی ہے اور نہ اس سے روکا گیا ہے۔

سوال: اچھا خواب آنے کی صورت میں کیا انداز اختیار کرنا چاہیے؟

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جواب: اچھا خواب آئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے اس میں کوئی چیز مستقبل کے بارے میں دکھائی گئی ہو تو دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اسے عملاً بھی پورا کر دے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ڈراؤنے خواب، بالعموم شیاطین کی طرف سے ہوتے ہیں اور اچھے خواب اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے۔ لیکن یہ لازم نہیں ہے۔ بالعموم ایسا ہوتا ہے۔

سوال: نیک اور گنہ گار شخص کے خواب میں کیا فرق ہوتا ہے؟

جواب: علم نفسیات کے ماہرین نے اب تک جو تحقیق کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نیک اور بد کا کوئی فرق نہیں۔ ہر طرح کے لوگوں کو ہر طرح کے خواب آ جاتے ہیں۔ صرف انبیا ہیں جن کے خواب اللہ تعالیٰ کی عنایات کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہما شما کے ساتھ اس معاملے میں ہر طرح کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

سوال: لیکن عمومی تاثر تو یہی ہے کہ نیک آدمی کا خواب سچا ہوتا ہے اور گنہ گار کا خواب جھوٹا؟

جواب: اس بات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ہمارے معیارات کے لحاظ سے ہرگز نیک نہیں ہوتے، لیکن ماہر نفسیات نے جو حقائق جمع کیے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بھی پے در پے ایسے خواب آ جاتے ہیں جو بالکل ٹھیک ثابت ہوتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال: شہروں میں بالعموم اور دیہاتوں میں بالخصوص لوگ خواب کی تعبیر کے لیے عالم دین سے رجوع کرتے ہیں۔ کیا دین کے عالم کا واقعی خواب کی تعبیر سے کوئی تعلق ہے یا پھر.........؟

جواب: خواب میں بالعموم چیزیں علامتی طور پر دکھائی جاتی ہیں، اس لیے وہ یقیناً محتاج تعبیر ہوتی ہیں۔ ان کی تعبیر کا دین کے علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص جو علامتوں سے حقائق تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ بہتر تعبیر کر سکتا ہے۔ یہ دیہات کا کوئی دانا بوڑھا بھی ہو سکتا ہے، علم نفسیات کا کوئی ماہر بھی اور علم و ادب کے اسالیب کو سمجھنے والا کوئی شخص بھی۔ اس میں دین کا عالم ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ جس شخص نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اس نے واقعی سچا خواب دیکھا، کیونکہ شیطان نبی کریم کی شکل اختیار نہیں کر سکتا؟

جواب: یہ بشارت صحابۂ کرام کے لیے تھی۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تسلی دی تھی کہ تم اگر مجھے خواب میں دیکھو گے تو چونکہ تم مجھے پہچانتے ہو، اس لیے شیطان کوئی دوسری صورت اختیار کر کے تمھیں دھوکا نہیں دے سکتا۔ ہم نے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، نہ یہ بشارت ہمارے لیے ہے۔

سوال: بعض لوگ خواب میں نبی کریم سے مذہبی رہنمائی لینے کا ذکر کرتے رہتے ہیں، کیا واقعی ایسا ہونا ممکن ہے؟

جواب: میرے خیال میں اس طرح کے لوگ، بالعموم نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں اور اپنی مذہبی اور سیاسی امنگوں کو اس طرح کے خوابوں میں دیکھتے رہتے ہیں۔ آدمی کو اپنے فیصلے علم و عقل اور قرآن و سنت کی روشنی میں کرنے چاہییں، خوابوں

کی بنیاد پر نہیں۔

سوال: کیا اب کسی شخص کو بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں نظر نہیں آ سکتے؟

جواب: میں نے جہاں تک اس علم کا مطالعہ کیا ہے، میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس امت کے ثقہ لوگوں کو جب بھی ایسا خواب آیا ہے، اس کا اسلوب علامتی ہی رہا ہے۔ اس میں بعینہٖ کوئی چیز نہیں دکھائی گئی۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کا یہ خواب بیان کیا جاتا ہے کہ وہ خود کو رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی قبر مبارک میں ہڈیاں جمع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی علمی میراث جمع کرائے گا۔ عام طور پر خواب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان میں اگر کوئی شخص نظر آتا ہے تو وہ بھی تمثیلی شکل ہوتی ہے۔ ہم کبھی کبھی اپنے ماں باپ کو خواب میں دیکھتے ہیں، ان سے باتیں کرتے ہیں، حالانکہ وہ ہمارے ساتھ کی چارپائی پر سوئے ہوتے ہیں۔ صبح کو اٹھ کر ان سے پوچھ لیجیے تو ان کو اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ مرنے کے بعد بھی ہوتا ہے۔

سوال: ہمارے معاشرے میں جھوٹے خواب بیان کرنے کا رواج بہت عام ہے۔ آپ جھوٹے خوابوں کے کھلے عام بیان کرنے کی کیا وجہ سمجھتے ہیں؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ اس میں لوگ اس طرح کی چیزوں سے بآسانی متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مفاد پرست لوگوں کو بیوقوف بنانے کا موقع مل جاتا ہے۔ مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ انھوں نے کسی مذہبی رہنما کے ساتھ مل کر لکڑی کا کاروبار کیا۔ کاروبار چل نکلا تو ایک دن حضرت نے بتایا کہ آج رات خواب میں ہم دونوں کے پیرومرشد نے ہدایت کی ہے کہ اب یہ سارا کاروبار میں اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ اب اس کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ یا پیرومرشد سے بغاوت کرے یا کاروبار سے ہاتھ دھو لے۔

سوال: کیا انسان کو اپنے خواب پر توجہ دینی چاہیے یا پھر اس سے صرف نظر کرنا چاہیے؟

جواب: خواب جب بھی آئیں گے، اپنی نوعیت کے لحاظ سے دیکھنے والے پر اثر انداز ہوں گے۔ کمزور نفسیات کے لوگ زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں۔ بندۂ مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اپنے پروردگار پر بھروسا کرے۔ اچھی باتوں پر اس کا شکر ادا کرے اور بری باتوں سے ہراساں ہونے کے بجائے مطمئن رہے کہ کوئی چیز بھی اللہ کے حکم کے بغیر واقع نہیں ہوتی۔

سوال: استخارہ کیا ہے۔ اسلام میں اس کی اہمیت پر آپ کیسے روشنی ڈالیں گے؟

جواب: استخارہ محض ایک دعا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دعائیں سکھائی ہیں، ان میں سے ایک دعا یہ بھی ہے۔ اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ بندہ جب کوئی فیصلہ کرے تو اس میں اپنی تدبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی یہ درخواست کرے کہ وہ اس پر خیر کا پہلو واضح کر دے۔ اس میں کوئی چیز دوسری دعاؤں سے مختلف نہیں ہے۔

سوال: عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ استخارہ کرنے والے شخص کو خواب میں اشارہ ہو جاتا ہے کہ فلاں کام بہتر ہے یا نہیں، مگر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کئی بار استخارہ کرنے والے کو قطعی کوئی اشارہ نہیں ہوتا، ایسی صورت میں وہ کیسے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے؟

جواب: استخارہ کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں تو بعض اوقات ہماری عقل ہی میں خیر کا پہلو آ جاتا ہے، کسی ذریعے سے ہمارے علم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اللہ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے خواب میں بھی رہنمائی ہو جاتی ہے۔

سوال: بعض لوگ جب استخارہ کرتے ہیں تو انھیں ان کی خواہش کے مطابق اشارہ نہیں ملتا۔ وہ دوبارہ یا سہ بارہ استخارہ کرتے ہیں، حتیٰ کہ انھیں پسند کا اشارہ مل جاتا ہے، ایسا کیوں کر ہوتا ہے؟

جواب: جی ہاں! بسا اوقات آدمی اپنے رجحانات اور خواہشات ہی کو خواب میں دیکھ لیتا ہے۔ انسانی نفسیات ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے کوئی چیز بار بار تجویز کی جائے تو وہی اس کے لاشعور کا حصہ بن کر خواب یا بے داری میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

سوال: ہمارے ہاں بعض لوگ علم نجوم، ستاروں کا علم، حال، قیافہ، ہاتھ کی لکیروں وغیرہ پر بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ اسلام ان کے بارے میں کیا رہنمائی کرتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے جس طرح جسمانی اور ذہنی لحاظ سے بعض لوگوں کو غیر معمولی صلاحیت دی ہوتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگ نفسی لحاظ سے غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ بارہا مستقبل کی بعض چیزوں کو قبل از وقت محسوس کر لیتے ہیں۔ اس صلاحیت کا کفر و ایمان سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس میں جس طرح آئن اسٹائن غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوا، اسی طرح بعض لوگ نفسی صلاحیتوں میں درجۂ کمال پر پہنچ جاتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگ جنات وغیرہ سے رابطہ کر کے بھی ایسی چیزیں لے لیتے ہیں جو انھوں نے فرشتوں سے اچک لی ہوتی ہے۔ اسی طرح قیافہ کے بعض علوم بھی ہیں جن کی روشنی میں آدمی بعض اندازے لگا لیتا ہے۔ ہاتھوں کی لکیریں، ستاروں کا علم اور بعض دوسری چیزیں اس میں شامل ہیں۔ بعض لوگ ان میں سے کسی ایک چیز اور بعض ایک سے زیادہ چیزوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہ سب اسی کے مظاہر ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں کے بجائے اللہ کی ہدایت اور اپنے علم و عقل کی روشنی میں زندگی بسر کرے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہندو مسلم فسادات

[مدیر ''اشراق'' سے روزنامہ ''پاکستان'' کے لیے ایک انٹرویو]

سوال: جاوید صاحب! مسلمانوں کا جب بھی کسی قوم سے جھگڑا ہو تو ہمارے اکثر علماے کرام اور دانش ور حقیقت حال کا جائزہ لینے کے بجائے پارٹی بن جاتے ہیں اور معاملے کو مسلمانوں کی عینک سے دیکھتے ہیں اور یہی صورت ہمیں دوسری اقوام کے اکثر دانش وروں اور علماے کرام کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ آپ کے خیال میں ہندوستان میں ہونے والے حالیہ فسادات کا اگر غیر جانب داری کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو اس میں مسلمان کس حد تک اور ہندو کس حد تک قصوروار ہیں؟

جواب: میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی قیادت نے لوگوں کو حقیقت شناس بنانے کے بجائے جذبات کے ذریعے سے سوچنے اور سمجھنے کی تعلیم دی ہے۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ نہ مسلمان قوم کی قیادت اپنی قوم کی کوئی اچھی تربیت کر سکی ہے اور نہ ہندوؤں کی قیادت۔ ہندوستان کے دور جدید میں سب سے بڑے رہنما مہاتما گاندھی خود اسی جنون کا شکار ہوئے اور ان کے مخالف قائدین کی تربیت سے جو لوگ پیدا ہوئے، انھی میں سے ایک نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہندوستان میں اگر ابوالکلام اور گاندھی کی سطح کے رہنما پیدا ہوتے رہتے تو توقع تھی کہ صورت حال تبدیل ہو جاتی، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ یہی معاملہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا ہے، ان کی قیادت نے بھی ان کی کوئی اچھی تربیت نہیں کی۔ جذباتی نعرے، انتقام اور بے معنی غیرت ان کی تعلیم کے بنیادی اجزا رہے ہیں۔ خود پاکستان میں جب مسلمان مسلمان کا گلا کاٹتا ہے تو یہ درحقیقت اسی تربیت کا نتیجہ ہے۔ جب میں بھی اس صورت حال پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں ہندو اور مسلمانوں کے مجموعی رویے میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔ تقسیم کے موقع پر فسادات میں اگر ہندوؤں نے ظلم و ستم کیا تو مسلمانوں نے بھی اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

سوال: حالیہ مسلم کش فسادات کی بڑی وجہ جنونی ہندوؤں کی ٹرین پر مسلمانوں کا حملہ قرار دیا جا رہا ہے۔ مگر کیا مسلم اقلیت ہندو اکثریت کو تشدد کا نشانہ بنا سکتی ہے؟

جواب: جو صورت حال غیر جانب دار ذرائع سے سامنے آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ٹرین کے مسافروں

نے اشتعال انگیز حرکتیں کیں اور پھر بعض مشتعل مزاج مسلمانوں نے نتائج وعواقب کا اندازہ کیے بغیر اس کا جواب دیا۔تمام فسادات کی داستان، بالعموم اسی طرح کی ہوتی ہے۔

سوال: ہزار سے زائد بے رحمانہ اموات پر عالمی برادری کا برائے نام ردعمل کیوں ہے؟ اور ہندوستان اب بھی مغرب کا پسندیدہ ملک کیسے ٹھیرا ہوا ہے؟

جواب: دنیا کی اقوام اپنے فیصلے سیاسی مصلحتوں، معاشی مفادات اور اپنے زاویۂ نظر سے حقائق کو دیکھ کر کرتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہم جس طرح سوچتے ہیں، سب لوگ اسی طرح سوچیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ دنیا کی بڑی اقوام اس میں ہندوستانی حکومت اور انتظامیہ کو قصور وار نہ سمجھتی ہوں۔ان کے نزدیک یہ معاملہ ایک حادثہ ہوسکتا ہے۔جس طرح کے حوادث خود ہمارے ملک میں مسجدوں، امام بارگاہوں اور گلیوں اور بازاروں میں پیش آتے رہتے ہیں۔

سوال: حالیہ صوبائی انتخابات کے نتائج اور فسادات کے تناظر میں آپ کو اٹل بہاری واجپائی مستقبل میں کہاں کھڑے نظر آتے ہیں؟

جواب: میرا ذاتی خیال ہے کہ واجپائی صاحب کی صحت اور قوی جواب نہ دے گئے تو اس وقت کی صورت حال میں انھیں ابھی کوئی خاص خطرہ لاحق نہیں ہے۔تاہم آنے والے دنوں میں وہ اگر جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے مضمحل ہو گئے تو ممکن ہے کہ ان کی حکومت ختم ہو جائے۔البتہ اتنی بات واضح ہے کہ آنے والے تمام انتخابات میں کانگریس کا مستقبل بہت روشن ہے اور غالباً ہندوستان کا اقتدار اب کانگریس کو منتقل ہو جائے گا۔

سوال: ایک تاثر یہ ہے کہ بی جے پی کی رام راج کی سرکار ہو یا کانگریس کی سیکولر حکومت، اسلام دشمنی اور مسلمانوں کے خلاف عناد دونوں میں مشترک ہے۔آپ کے خیال میں ہندوستان کے مسلمان اپنے حالات میں کیسے بہتری پیدا کر سکتے ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔اصل فرق اس وقت واقع ہوگا جب ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت اقلیت کی حیثیت سے مسلمانوں کو جینے کا بہتر سلیقہ سکھانے میں کامیاب ہو جائے گی۔مسلمان جس طرح مغربی ممالک میں جا کر رہتے ہیں، اگر وہی رویہ ہندوستان میں بھی اختیار کر لیں اور اپنی تمام جدوجہد قومی تعمیر، اخلاقی اصلاح، تعلیم اور معیشت میں برتری حاصل کرنے پر مرکوز کر دیں تو ان کے معاملات بہتر ہو جائیں گے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ اٹل بہاری واجپائی صوبائی انتخابات میں کامیابی کے لیے فوجیں سرحدوں پر لائے ہیں۔اب تو انتخابات ہو گئے، نتائج سامنے آ گئے، مگر فوجیں بدستور سرحدوں پر ہی ہیں۔کیا ان کی پرامن واپسی ہوگی یا پھر آپ جنگ کا کوئی امکان دیکھتے ہیں؟

جواب: میرا ذاتی خیال ہے کہ ہندوستان جو مطالبات منوانا چاہتا ہے، ان میں کچھ نہ کچھ پیش رفت کے بعد ہی فوجیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سرحدوں سے واپس بلائی جائیں گی۔ میرا گمان ہے کہ اندرونِ خانہ کچھ نہ کچھ پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس لیے فی الحال کوئی جنگ کا خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک جنگ کا شروع میں بھی کوئی امکان نہ تھا، بلکہ کچھ مقاصد حاصل کرنے پیش نظر تھے۔ ہندوستان نے اس کے لیے فضا سازگار دیکھی تو پورا دباؤ ڈال دیا۔ اب یہ اعصاب کی جنگ ہے دیکھیے اس میں کون کتنا کامیاب ہوتا ہے۔

سوال: آج کل ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی وجہ بابری مسجد، رام مندر تنازع بنا ہوا ہے۔ آپ کی نظر میں اس کا حل کیا ہے؟

جواب: ہندوستان میں کئی مقامات پر اس طرح کے تنازعات موجود ہیں، ان کا بہترین حل یہی ہے کہ دونوں فریق عدالت یا ماہرین تاریخ کی کسی کونسل کا فیصلہ مان کر امن کے ساتھ ان تنازعات کو طے کر لیں۔

اس طرح کی صورت حال میں مسلمانوں کو تشدد کا جواب تشدد سے نہیں دینا چاہیے۔ یہ طرز عمل انھیں اخلاقی لحاظ سے بہتر جگہ پر کھڑا کرے گا۔ دنیا میں ہر جگہ ان کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ جوابی تشدد سے وہ نہ صرف یہ کہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے، بلکہ مزید نقصان اٹھائیں گے۔ مسلمانوں کو طے کر لینا چاہیے کہ وہ ہر معاملہ کو قانون کے دائرے میں رہ کر قانون کی مدد سے طے کرنے کی کوشش کریں گے۔ تشدد نہ اس سے پہلے کسی مسئلے کا حل ثابت ہوا ہے اور نہ مستقبل میں ہو گا۔ تشدد کے پیٹ سے صرف تشدد پیدا ہوتا ہے۔ اس سے کہیں امن اور سلامتی جنم نہیں لیتی۔

سوال: انتہا پسند ہندو سپریم کورٹ کے فیصلہ کے باوجود طاقت کے بل بوتے پر مندر بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ چل نکلا تو نجانے کتنی اور مساجد کو مندروں کا روپ دے دیا جائے۔ اس صورت میں مسلمان کیسے خاموش رہ سکتے ہیں؟

جواب: اول تو اس کا کوئی امکان نہیں ہے، لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہوا اور مسلمانوں نے جوابی تشدد سے کام نہ لیا تو بتدریج یہ چیز ہندوؤں کے سوچنے سمجھنے والے طبقوں کو مسلمانوں کی حمایت پر آمادہ کر دے گی۔ اس وقت بھی پڑھے لکھے ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ان چیزوں کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ضرورت صرف اس چیز کی ہے کہ دنیا پر اپنے عمل سے ثابت کر دیا جائے کہ ایک طرف تشدد اور وحشت ہے اور دوسری جانب علم، اخلاق اور قانون کی پابندی۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خورشید احمد ندیم

ہاشمیہ سے اسلام آباد تک

یہ آٹھویں صدی کا ہاشمیہ ہے، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کا پایۂ تخت۔ اموی معزول ہوئے اور عباسی مسند آرا۔ یہ تخت نشینی کسی استحقاق کا نہیں قوت بازو کا نتیجہ ہے۔ تمام تر مخاصمت کے باوجود، عباسیوں کو امویوں کی یہ ادا پسند آئی کہ حکومت سازی کے لیے عامتہ الناس کی تائید لازم نہیں۔ اس کے ساتھ امویوں کی یہ خواہش بھی ان کی طرف منتقل ہوئی کہ لوگوں کے گلے میں ہماری اطاعت کا طوق ہو۔ معاشرے کے مذہبی پس منظر کے پیش نظر وہ اس بات کے متمنی بھی تھے کہ کتاب شریعت اور آئین تہذیب سے کوئی ایسی سند حکمرانی مل جائے کہ ہمارے خلاف کوئی علم بغاوت بلند نہ ہو اور اگر کوئی یہ جسارت کرے تو اسی کتاب اور آئین کی دلیل سے اسے باغی اور فساد فی الارض کا مجرم قرار دے کر اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ ماہرین جمع ہوئے اور ان کے مشورے سے ایک عبارت پر اتفاق ہو گیا: ''جس کی گردن میں عباسی خلیفہ کی بیعت کا قلابہ نہ ہو گا، اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔'' لوگ سہم گئے اور اقتدار مضبوط ہو گیا۔ تنہا مالک ابن انس کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں اس حکم کو خلاف شریعت اور اگر لغت عصر میں عرض کروں تو خلاف آئین سمجھتا ہوں۔ میں اس قصے کو یہیں تمام کرتا ہوں اور دانستہ اس پہلو سے صرف نظر کرتا ہوں کہ مالک بن انس کو اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑی۔

اور پھر یہ آٹھویں صدی کا بغداد ہے، منصور کا آباد کیا ہوا۔ وہ عظیم الشان شہر کہ جہاں امام ابو حنیفہ نے اس بنا پر دفن ہونا گوارا نہ کیا کہ اس کی بنیادوں میں غریبوں کا لہو تھا۔ اب بادشاہ وقت منصور کے پوتے کو ایک مسئلہ درپیش ہے۔ آئینی ماہرین دارالحکومت میں جمع ہوئے اور ان کے سامنے بادشاہ کی پریشانی رکھی گئی۔ ایک لونڈی پر بادشاہ کا جی آ گیا۔ قربت کی آرزو بڑھی تو ضبط کے بند قبا کھلنے لگے۔ لونڈی نے عرض کیا: ''حضور، میں تو آپ کے والد گرامی کی مدخولہ ہوں۔'' شریعت پسند بادشاہ کے بڑھتے ہوئے قدم اور ہاتھ رک گئے۔ فقہ کا مسئلہ ہے کہ باپ کی لونڈی، بیٹے کے تصرف میں نہیں آ سکتی۔ بادشاہ اس لمحے

تو رک گیا، لیکن دل تھا کہ مان کر نہیں دے رہا تھا۔ خیال کیا کہ ماہرین فقہ ہی سے کیوں نہ رجوع کیا جائے۔ شاید وہ کوئی حل نکال سکیں۔ اپنے عہد کے ایک بڑے فقیہ کو طلب کیا، جسے اس کے عہد کے لوگ ''جادوگر'' کہتے تھے۔ مسئلہ ان کے سامنے رکھا گیا۔ انہوں نے سنا اور اطمینان سے جواب دیا: ''لونڈی آپ پر حلال ہے۔'' بادشاہ چونکا، اس کا اشتیاق بڑھا، پوچھا: ''کیسے'' فقیہ نے سوال کیا: ''یہ بات آپ کو کس نے بتائی کہ وہ آپ کے باپ کی لونڈی رہی ہے؟'' مامون نے کہا: ''خود اس لونڈی نے۔'' ماہر قانون نے کہا: ''لونڈی کی گواہی کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیا معلوم وہ جھوٹی ہو۔ پھر آپ کو کیا پڑی کہ اس کے سچ جھوٹ کی تصدیق کریں۔ اس لیے آپ کے تمتع کے راستے میں کوئی شرعی عذر حائل نہیں۔'' جنھیں اس روایت کی صحت میں کلام ہے، وہ فقیہ کی صفائی دیتے ہیں، خلیفہ کی نہیں۔ وہ بھی اس سے متفق ہیں کہ بادشاہ ایسے عذر تراشتے تھے اور ان کے دربار میں ان کی سیئات کو حسنات قرار دینے والے آئینی ماہرین کی کمی نہیں تھی۔

پھر اے مبصرین کرام! یہ بیسوی صدی کا اسلام آباد ہے۔ بغداد اور اسلام آباد میں سیکڑوں میل ہی نہیں سیکڑوں برس بھی حائل ہیں۔ لیکن تاریخ کچھ اس طرح اپنے آپ کو دہرا رہی ہے کہ ہر نقش قدم پر قدم ہے اور ہر پاؤں پر پاؤں! یہ ہم نے بھی سن رکھا ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے، اس کا سفر خط مستقیم پر نہیں، دائرے میں ہے، لیکن یہ گمان نہ تھا کہ یکسانی کا یہ عالم ہوگا کہ حیرت کو بھی حیرت ہونے لگے۔ اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم گزری اقوام کے ہر نقش قدم پر اپنا قدم رکھو گے اور اس مماثلت کا یہ عالم ہوگا کہ جیسے بالشت کے ساتھ بالشت اور گز کے ساتھ گز ملتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی سوسمار میں داخل ہوا ہے تو تم بھی اسی میں جا نکلو گے۔ اللہ کے رسول کی طرف اگر اس روایت کی نسبت میں کچھ کلام نہیں تو پھر آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔ ہم اقوام رفتہ کی تقلید تو ویسے ہی کریں گے جیسے آپ نے پیش گوئی فرمائی، لیکن ہم ایک دوسرے کی تقلید میں بھی نقالی کا یہ معیار قائم کریں گے، میں سوچ نہیں سکتا تھا۔

www.javedahmadghamidi.com

ذکر بیسویں صدی کے اسلام آباد اور آٹھویں صدی کے بغداد میں مماثلت کا ہے، اسلام آباد اگر اپنے عہد کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کا پایۂ تخت ہے تو بغداد اپنے دور کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کا دارالخلافہ تھا۔ مسئلہ وہی پرانا ہے۔ ایک حکومت معزول ہوئی اور ایک شخص مسند آرا۔ اسے آنے کے لیے کسی اخلاقی جواز کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، لیکن اسے طوالت اقتدار کے لیے کسی فقہی یعنی آئینی دلیل کی طلب ہوئی شاید وہ بھی امویوں اور عباسیوں کی طرح خوف زدہ تھا کہ کہیں اس کے خلاف علم بغاوت نہ بلند ہو۔ آئینی ماہرین کے قافلے دارالحکومت میں اترنے لگے اور انھوں نے بیعت عام کے لیے ایک آئینی حل تلاش کر لیا۔ ارشاد ہو کہ لوگوں سے رجوع کیا جائے: ''اے عامتہ الناس! کیا تم اسلام چاہتے ہو؟ اگر تمھارا جواب اثبات میں ہے تو میں پانچ سال کے لیے تمھارا صدر رہوں۔'' صرف یہی نہیں، جب بھی حکمرانوں کو کوئی ایسا امتحان درپیش ہوا، کوئی ''جادوگر'' دارالخلافہ میں اترا اور اپنے جادو کے زور سے مشکل کو آسان کر گیا۔ ہاشمیہ اور بغداد سے

اسلام آباد تک ایک ہی روایت کا تسلسل ہے۔ بیچ میں اگرچہ سیکڑوں برس حائل ہیں، لیکن واقعات خود کو یوں دہرا رہے ہیں کہ یہ طالب علم وادی حیرت میں کھڑا ہے۔ افتخار عارف نے کسی اور تناظر میں جو کچھ کہا، اس کا اطلاق یہاں بھی تو ہوتا ہے:

وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے، وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

آج عباسیوں کی روایت زندہ ہے۔ فقہی اور آئینی ماہرین آج بھی ویسے ہی ہیں۔ کتاب الحیل آج بھی ماخذ ہدایت ہے۔ سب کچھ وہی ہے، ہاں، اگر نہیں ہے تو مالک ابن انس جیسا کوئی نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ لوگ حزب اختلاف کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں بھی کچھ لوگوں نے اس روایت کو زندہ کرنے کی سعی کی تھی، لیکن سب کچھ نقش برآب ثابت ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عباسیوں کے جانشین تو تقلید میں سچے ہیں، لیکن مالک ابن انس کے نام لیوا اس رفعت فکر اور جرات کردار سے خالی ہیں جس نے انھیں امام وقت بنایا۔ یہ وہ منزل ہے جہاں سے ہماری تاریخ کا سفر دائرے کے بجائے خط مستقیم پر شروع ہو جاتا ہے۔ کاش اس باب میں بھی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی!

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید احمد ندیم

کیا فلسطین کو بچایا جا سکتا ہے؟

اعلان بیروت مشرق وسطیٰ میں قیام امن کی بنیاد بن سکتا ہے۔اسے آپ پیش گوئی کہہ سکتے ہیں،لیکن یہ کچھ مقدمات کے ساتھ مشروط ہے۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ آج امن اسرائیل کی ضرورت ہو نہ ہو، ہماری ضرورت ہے ۔اہل فلسطین اپنے مسئلے کو مذہبی نہیں سمجھتے۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے، کیونکہ اہل فلسطین میں عیسائی بھی شامل ہیں جو اسرائیل سے آزادی چاہتے ہیں۔ لیکن مسئلۂ فلسطین سے ہماری وابستگی کی بنیاد مذہب ہے۔ہم اسے مسلمانوں کا قبلۂ اول کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہاں کا اقتدار مسلمانوں کا حق ہے۔اسی بنا پر ہم اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتے۔اسی تناظر میں دیکھیے تو آج وہاں جو تحریک مزاحمت جاری ہے،اس کے نتیجے میں زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔اگر ایک اسرائیلی مرتا ہے تو ایڈورڈ سعید کے مطابق پانچ مسلمانوں کو اپنی جان دے کر اس کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔کہتے ہیں کچھ عرصہ پہلے یہ نسبت ایک اور پچاس کی تھی۔اس مزاحمت سے اسرائیل کی معیشت کو ضرور نقصان پہنچا ہو گا۔لیکن اہل فلسطین تو معیشت نام کی کسی چیز ہی سے واقف نہیں رہے۔ساری دنیا کے مسلمان فلسطین میں اٹھنے والے نقصان پر دل گرفتہ رہتے ہیں اور یہ ان کے لیے ایک نفسیاتی روگ بن چکا ہے۔عرب ملکوں کے لیے یہ بالخصوص ایک سیاسی، معاشی اور اخلاقی مسئلہ ہے۔اس لیے اگر موجودہ حالات کا تسلسل باقی رہتا ہے تو خسارے میں مسلمان ہی رہیں گے۔یہی وجہ ہے کہ میں امن کو اہل فلسطین کی نہیں ''ہماری''ضرورت کہتا ہوں۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی حکمت عملی نئے سرے سے متعین کرنا ہو گی۔ہم نے مزاحمت کی تو اس کا انجام بھی دیکھ لیجیے!افغانستان آج ایک بنجر زمین ہے۔زندگی جس کے لیے ایک اجنبی شے بن گئی ہے۔

آج افغانستان کا معاملہ تو ہمارے ہاتھ میں نہیں رہا۔ پیار و محبت کا سلسلہ باقی ہے نہ سفارت کا، افغان اپنے پاکستان بھائیوں کو لاکھ اور دو لاکھ میں بیچ رہے ہیں اور ہم کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتے،لڑنے والے کیوبا میں بند ہیں یا پھر ہماری اپنی جیلوں میں۔ یہ ہے انجام ہماری ایک مزاحمت کا، رہی بات کشمیر کی تو آج اس کے سلگتے چناروں پر ہم پانی بھی نہیں ڈال سکتے۔ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان چناروں سے کب تک یونہی دھواں اٹھتا رہے گا۔ یہ دوسری مزاحمت کا نتیجہ ہے۔ فلسطین

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں اگر ہم نے اسی حکمت عملی پر اصرار جاری رکھا تو ہماری منزل خاکم بدہن، افغانستان اور کشمیر سے مختلف نہیں ہوگی۔

فلسطین میں، البتہ مسلح مزاحمت کے علاوہ ایک دوسری رائے بھی موجود ہے جس کا اظہار ''اعلان بیروت'' کی صورت میں ہوا ہے اور اسے میں امید کی کرن قرار دیتا ہوں۔ عرب لیگ کا جو اجلاس جمعرات کو بیروت میں ختم ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برف پگھلنے لگی ہے۔ حقیقت پسندی رومانویت پر غالب آ رہی ہے اور عرب قیادت نے درست سمت میں ایک قدم اٹھایا ہے۔ عراق اور کویت میں صلح، کوئی معمولی پیش رفت نہیں۔ میں اسے بھی ایک غیر معمولی واقعہ قرار دیتا ہوں۔ آج کئی ممالک بش کو عراق پر حملے سے روک رہے ہیں اور بائیس عرب ممالک متفقہ طور پر اقوام متحدہ سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ عراق کے خلاف عائد پابندیاں اٹھا دے۔

اسرائیل کا تازہ ردعمل اگرچہ مثبت نہیں، لیکن جب پہلی مرتبہ شہزادہ عبداللہ نے اپنا امن فارمولہ پیش کیا تو اسرائیل نے اس کا خیر مقدم کیا تھا اور اس کے صدر نے سعودی عرب جانے پر رضا مندی ظاہر کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ شہزادہ عبداللہ اگر بیت المقدس آنا چاہیں تو وہ انھیں خوش آمدید کہیں گے۔ اس لیے امید کی جانی چاہیے کہ جیسے جیسے بات آگے بڑھے گی، اسرائیل کا رویہ تبدیل ہوگا۔ امریکا ''اعلان بیروت'' کا خیر مقدم کر چکا ہے۔ یورپی یونین پہلے ہی امریکا کی اس پالیسی پر خوش نہیں جو اس نے مشرق وسطیٰ کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے اور وہ مسئلہ فلسطین کے فوری حل پر زور دے رہی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ مسلمان پوری طرح اس عمل کی تائید کریں اور اپنا وزن اس پلڑے میں ڈال دیں جس سے فلسطین میں مسلمانوں کے جان و مال محفوظ ہونے کا امکان پیدا ہو اور انسانی جان کی ارزانی کا یہ سلسلہ ختم ہو۔ حماس کا ابتدائی ردعمل کچھ ایسا حکیمانہ نہیں ہے۔ اہل حماس کا اخلاص اپنی جگہ، لیکن انھیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ محض ایسے حل کے لیے اہل فلسطین کی قربانی کب تک جاری رہے گی جس کے ظہور پزیر ہونے کا سر دست کوئی امکان نہیں۔ اس لیے آج ضروری ہے کہ ہم اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں اور مسلح مزاحمت کے بجائے سیاسی جدوجہد سے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یک سو ہو جائیں۔ بصورت دیگر مجھے ڈر ہے کہ ہم کشمیر اور افغانستان کی طرح شاید اس قابل بھی نہ رہیں کہ کوئی سیاسی حل ہی تجویز کر سکیں۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ ہم اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہ کریں کہ ہر مسئلے کی آخری منزل مذاکرات کی میز ہے۔ یہ ہمارا انتخاب ہے کہ سب کچھ لٹا کر مذاکرات پر آمادہ ہوں یا اس سے پہلے ہی اس پر تیار ہو جائیں۔ مذاکرات میرے نزدیک اس عمل کا نام ہے کہ زمین پر موجود ان امکانات کو محفوظ کر لیا جائے جو مستقبل کے لیے امید بن سکتے ہیں۔ مذاکرات میں ہمیشہ کمزور فریق کا فائدہ ہوتا ہے۔ ہم نے آج کمزور حیثیت میں ہوتے ہوئے جو معاہدے کیے، میرا خیال ہے کہ ہمیں ان سے فائدہ ہوا۔ معاہدۂ تاشقند ہمارے حق میں تھا، کیونکہ ہم مزید جنگ نہیں کر سکتے تھے۔ شملہ معاہدہ بھی ہماری ساکھ اور باقی ماندہ ملک کے تحفظ کا ضامن بنا۔ اس موقع پر ہماری کمزوری ایک واضح بات تھی۔ آج فلسطین میں ہم کمزور ہیں۔ اگر وہاں کوئی ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہم مزید زیاں سے بچ سکتے ہوں تو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ صدر کلنٹن نے اپنی صدارت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کے آخری دنوں میں مسئلۂ فلسطین کا ایک حل پیش کیا تھا جس میں اسرائیل اور فلسطین کی صورت میں آزاد ریاستوں کے قیام کی بات کی گئی تھی اور اس کے ساتھ یروشلم کو ایک کھلا شہر قرار دینے کی تجویز دی گئی تھی۔ میرے نزدیک موجودہ حالات میں یہ ایک بہترین حل تھا۔ افسوس کہ ہم نے اس وقت اسے بغیر سوچے سمجھے رد کر دیا۔

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ کشمیر اور افغانستان سے سبق سیکھتے ہوئے ہمارا آیندہ کا لائحۂ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم موجودہ طاقت کو ضائع ہونے سے بچائیں، اپنی صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہوئے تعمیر نو کے لیے سرگرم ہوں اور اس وقت تک تصادم سے گریز کریں، جب تک وسائل کے اعتبار سے ہم اپنے مخالف کے ہم پلہ نہیں ہو جاتے۔ مشرق وسطیٰ کے مسئلے کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

یہ مقدمات قائم کرتے ہوئے اگر ہم اعلان بیروت کے عمل کو آگے بڑھائیں تو مجھے امید ہے کہ یہ ایک نئے دور کی خشت اول بن سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا دور ہوگا جس میں یہ لازم نہیں ہوگا کہ ہر مقتل مسلمانوں ہی سے آباد ہو۔ شہزاد عبداللہ مجھے گمان ہوتا ہے کہ اس نئے دور کے معمار اول ہیں۔ عراق کے بارے میں عرب قیادت کا رویہ بتاتا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امریکی گرفت کمزور پڑ رہی ہے۔ آج ہمیں پھر صلح حدیبیہ کا مرحلہ پیش ہے۔ آج پھر کسی مومنانہ فراست کی ضرورت ہے۔ اعلان بیروت کی روشنی کی ایک کرن ہے، لیکن میں مکرر عرض کرتا ہوں کہ اس روشنی کا پھیلنا چند مقدمات کے ساتھ مشروط ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایمان کی روح

''کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا، اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتے۔'' (آل عمران ۳: ۳۱۔۳۲)

ان آیات میں وہ رویہ بیان ہوا ہے جو ایک سچے مسلمان کو اختیار کرنا چاہیے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ سے محبت کا کیا مطلب ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن مجید کے اس مقام سے واضح ہے کہ ایمان کی اصل روح اللہ سے سچا اور محبت بھرا تعلق ہے۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی محبت جمع نہ ہونے پائے۔ جو اس کی ضد ہو اور کوئی جائز محبت اس کی برابری نہ کر سکے اور نہ اس کے مقابل میں قابل ترجیح قرار پائے۔ مثلاً خدا اور دین کے دشمنوں کی محبت اور خدا کی محبت بندۂ مومن کے دل میں جمع نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اسی طرح مال و اولاد کی محبت اگرچہ ایک جائز محبت ہے، مگر ایمان کا تقاضا ہے کہ یہ محبت نہ اللہ و رسول کی محبت کی برابری کرے اور نہ ان کے مقابل میں زیادہ پسندیدہ بن جائے۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ بندۂ مومن کے لیے اصل مقصود یعنی اللہ کی محبت کو پانے کا واحد ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے۔ اس سے ہٹ کر جو راستہ بھی اختیار کیا جائے گا، اس سے یہ مقصد ہرگز حاصل نہ ہو سکے اور وہ دین میں بدعت و ضلالت قرار پائے گا۔ رسول کی پیروی سے انحراف کرتے ہوئے زندگی گزارنے والا دراصل اپنے آپ کو منکرین کی صف میں کھڑا کرنے کا خطرہ مول لیتا ہے اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ حق کا انکار کرنے والوں کو کبھی دوست نہیں رکھتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایمان کی اصل روح، یعنی خدا کی محبت کو پانے کے لیے خدا کا تجویز کردہ راستہ یہ ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے پر زندگی گزاریں اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں۔ انھیں چھوڑ کر خدا

ورسول سے محبت کی نئی نئی راہیں نکالنے کا نتیجہ دنیا میں اللہ کی محبت سے محروی اور آخرت میں جنت کے حصول میں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ـــــــ محمد اسلم نجمی

خدا کی بندگی

بے شک تمھارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا کیا، پھر وہ معاملات کا انتظام سنبھالے عرش پر متمکن ہوا۔ اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے تو اسی کی بندگی کرو، کیا تم سوچتے نہیں۔ (یونس ۱۰:۳)

اس آیت کے اولین مخاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم بنی اسمٰعیل کے لوگ ہیں۔ مشرکین مکہ اللہ کو اُس کی ذات کی حد تک تو وحدہ لاشریک مانتے تھے، مگر اس کی صفات میں دوسروں کو شریک ٹھیرا کر انھیں الوہیت کے منصب پر فائز کر دیتے تھے۔ انھیں بتایا گیا ہے کہ جس اللہ نے زمین و آسمان بنائے ہیں، وہی تمھارا رب اور آقا و مولیٰ ہے۔ لہٰذا جیسے اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے، اسی طرح وہ اپنی صفات اور حقوق میں بھی یکتا ہے۔ وہ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر نہیں بیٹھ گیا، بلکہ وہ اس کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے اور تنہا اس کا نظام چلا رہا ہے۔ وہ افراد اور قوموں کے ساتھ اپنے اصول وقوانین کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ ایسے قاعدوں اور ضابطوں کو، جن کے مطابق وہ صفحۂ ہستی پر قوموں کے عروج و زوال اور بقا و فنا کی داستانیں رقم کرتا ہے۔ قرآن مجید میں انھیں اللہ کی سنتیں کہا گیا ہے اور ان کے بارے میں اس کا حتمی فیصلہ ہے کہ وہ اپنی سنتوں میں کوئی رد و بدل نہیں کرتا[1]۔ اور نہ اس کی مخلوق میں سے کسی کو یہ زور و اختیار حاصل ہے کہ اسے ان سنتوں میں کسی تبدیلی اور ترمیم اور اضافہ پر مجبور کر سکے۔ اس لیے اگر کوئی کوتاہ فہم مخلوق میں سے کسی کو اس کی ربوبیت میں شامل کر کے اپنا الٰہ بنا لیتا ہے اور پھر اس سے یہ توقع باندھ لیتا ہے کہ وہ ہستی قیامت میں خدا کی مرضی کے خلاف اس کے کام آ سکے گی تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ اسی بات کو (کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے[2]) '' کے

---

[1] الاحزاب ۳۳:۶۲، فاطر ۳۵:۴۳، الفتح ۴۸:۲۳۔

[2] البقرہ ۲:۲۵۵۔

الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

انسان اپنی ضعیف الاعتقادی کے باعث اکثر اوقات ایسی گمراہیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔شرک ایک عالم گیر ضلالت ہے۔ یہ ضلالت مشرکینِ مکہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے آثار وشواہد ہر دور میں موجود رہے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ مسلمان معاشرے بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہے۔

آج کے دور میں اگرچہ اپنے آپ کو ہم دین توحید کے علم بردار سمجھتے ہیں، مگر اس کے باوجود شرک کی بہت سی خفی اور جلی صورتیں اختیار کیے ہوئے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہم یہ جرم دین کے نام پر کررہے ہیں۔

قرآن مجید میں دوٹوک الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ شرک نا قابل تلافی جرم ہے[۳]۔اس لیے بندۂ مومن کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ قرآن کی روشنی میں اپنے عقیدۂ توحید کی اصلاح کرے۔

______ محمد اسلم نجمی

قیامت کا وعدہ

''(وہ اللہ جس نے زمین وآسمان کو چھ ادوار میں پیدا کیا، جو کائنات کا انتظام سنبھالے عرش پر متمکن ہے اور جس کے ہاں کوئی سفارش کام نہ آئے گی)۔اسی (اللہ) کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے، ان کو عدل کے ساتھ بدلہ دے اور جنھوں نے کفر کیا، ان کے لیے اس کفر کی پاداش میں کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے۔'' (یونس ۱۰:۴)

یہ آیت اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ یہ دنیا بے غایت اور بے مقصد پیدا نہیں کی گئی ہے، اسے بہر حال اپنے انجام کو پہنچنا ہے۔ایک دن آئے گا جب صور پھونکا جائے گا۔تو یہ کائنات ختم ہو جائے گی۔ یہ زمین دوسری زمین سے اور یہ آسمان دوسرے آسمانوں سے بدل دیے جائیں گے۔(۱۴:۴۸) اور سارے لوگ عالم کے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ ہر ایک بغیر کسی ساز وسامان کے یکہ وتنہا پیش ہوگا۔(۱۹:۹۵) اور اس کا کوئی حامی و مددگار اور شفیع وسفارشی اس کے ساتھ نہ ہوگا۔ الغرض اللہ کا قیامت کا وعدہ شدنی ہے وہ بہر حال پورا ہوگا۔

البتہ یہ بات جان لینی چاہیے کہ اللہ چونکہ اصلاً رحمٰن ورحیم ہے، اس کی رحمت کائنات کی ہر چیز پر حاوی ہے اور اس نے

۳؎ النساء۴:۴۸،۱۱۶۔

اپنے اوپر لازم ٹھہرالیا ہے کہ وہ کائنات کا نظام رحمت ہی کی بنیاد پر چلائے گا۔اس لیے جب یہ دنیا اپنے انجام کو پہنچے گی تو قیامت اصلاً اللہ کی رحمت کے ظہور کے لیے برپا ہوگی۔اس کا اصل مقصد اہل ایمان کو دنیا کی آزمایش میں کامیابی کے بعد آخرت کی ابدی بادشاہی کی بشارت دینا ہے۔باقی چیزوں کی حیثیت اسی حقیقت کے لوازم اور توابع کی ہوگی۔اہل کفر کو سزا دراصل اس کے نتیجے کے طور پر ملے گی۔

اس ساری بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قیامت کی خبر اصلاً اہل ایمان کے لیے بشارت ہے،مگر وہ لوگ جو دنیا کی آزمایش میں ناکام ہوں گے ان کے لیے دردناک عذاب کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

______ محمد اسلم نجمی

اللہ تعالیٰ کو جھٹلانا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ اللہ نے فرمایا: ابن آدم (انسان) نے مجھے جھٹلایا حالانکہ اسے یہ زیب نہ دیتا تھا۔اور اس نے مجھے گالی دی جب کہ یہ اس کے لائق نہ تھا۔(پھر ان دونوں باتوں کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ) اس کے مجھے جھٹلانے سے مراد اس کا یہ کہنا ہے کہ اللہ مجھے مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ زندہ نہ کرے گا جیسا کہ اُس نے مجھے پہلی بار پیدا کیا، حالانکہ پہلی مرتبہ پیدا کرنا اس کے دوبارہ لوٹانے (یعنی مرنے کے بعد زندہ کرنے) سے زیادہ مشکل ہے،اور اس کے گالی دینے سے مراد اس کا یہ کہنا ہے کہ اللہ کی اولاد ہے، جبکہ میں سب سے الگ ہوں، سب کا سہارا ہوں اور میں وہ (ہستی) ہوں جو نہ باپ ہے نہ بیٹا اور میرا کوئی ہم سر نہیں ہے۔(مشکوٰۃ،رقم ۲۰)

اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک مکالمے کا ذکر ہوا ہے۔یہ حدیث اپنے مدعا کے اعتبار سے بالکل واضح ہے،البتہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ خدا کو جھٹلانے اور گالی دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی زبان سے ایسے جملے ادا کرے جن میں (معاذ اللہ) خدا کو برا بھلا کہا گیا ہو یا اس پر بہتان لگایا گیا ہو۔ایک شخص اگر زبان سے کوئی لفظ ادا کیے بغیر اپنے پروردگار کے بارے میں بے پروائی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرے اور خدا کے علاوہ دوسروں کے آستانوں سے بھی مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لیے وابستہ ہو جائے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے زبان سے اللہ کو جھٹلایا اور گالی دی۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمایش کے اصول پر بنائی ہے۔دنیا کی زندگی میں اس کی آزمایش یہ ہے کہ وہ آخرت کے بارے

میں خدا کے وعدوں پر اعتبار کرے۔ وہ ہر حال میں خدا کا بندہ بن کر جینے کا عہد کرے اور اس کا اصل مسئلہ آخرت میں خدا کی جنت کا حصول ہو۔

اس کے برخلاف وہ اگر دنیا ہی کی طلب میں جیتا اور مرتا ہے تو گویا وہ خدا کی مرضی کے خلاف زندگی گزارتا اور دنیا کی آزمایش اور آخرت کے وعدوں کو بے اصل خیال کرتا ہے۔ یہ طرز عمل (معاذ اللہ) خدا کو جھوٹا قرار دینے کے مترادف ہے۔

اسی طرح خدا وحدہ لاشریک ہے۔ توحید اصل ایمان ہے۔ اللہ کے سارے پیغمبر توحید ہی کی منادی کرنے کے لیے تشریف لائے۔ الہامی کتابیں اور مقدس صحیفے اسی توحید کی شرح و وضاحت کے لیے نازل ہوئے۔ اور آخرت میں حشر اسی توحید کے تقاضوں کی جواب دہی کے لیے برپا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ پر قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ایمان لے آیا، اس نے دین کی اصل حقیقت کو پالیا۔ وہ دنیا کی آزمایش میں کامیاب اور آخرت میں بامراد ہوا۔ اور جس نے خدا کی ذات، صفات یا حقوق میں کسی کو شریک ٹھیرایا، اس نے گویا دین کی اصل بنیاد ڈھادی اور خدا کو گالی دی۔

______ محمد اسلم نجمی

زمانے کو برا بھلا کہنا

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (اللہ تعالیٰ سے اپنے ایک مکالمے کی روداد بیان کرتے ہوئے) خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ابن آدم زمانے کو برا بھلا کہہ کر مجھے ایذا دیتا ہے کیونکہ زمانہ تو میں خود ہی ہوں۔ اور کائنات کے سارے معاملات کی باگ ڈور میرے ہی ہاتھ میں ہے۔ دن رات میں جو کچھ واقع ہوتا ہے۔ وہ میرے ہی تصرف کے باعث ہوتا ہے۔'' (مشکوٰۃ، رقم ۲۲)

بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بے تدبیری اور شامت اعمال کا گلہ تقدیر سے کرتے ہیں اور الزام زمانے کو دیتے ہیں۔ اسی طرح شاعر حضرات بھی آسمان، فلک اور گردش دوراں کا نوحہ پڑھتے رہتے ہیں۔

اس روایت میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ آسمان اپنی گردش سے کوئی چیز پیدا نہیں کرتا۔ انسان پر جو حالتیں گزرتی ہیں اور اسے جن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ سب کچھ اللہ کے اذن کے تحت اور اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ گردشِ لیل و نہار اور عالم کے نظام کے پیچھے اللہ ہی کا ارادہ کارفرما ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں جو کچھ واقع ہوتا ہے اور انسان کو جو احوال پیش آتے ہیں، ان کے پیچھے اللہ کی بے شمار حکمتیں کارفرما ہوتی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دنیا کی زندگی میں ہمیں ہر قسم کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ ہم ہر حال میں خدا کے شکرگزار بندے بن کر رہیں۔ ہم پر جو مشکلات آتی ہیں، وہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی حکمت لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ یہ ہماری شامت اعمال کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عالم کا پروردگار ان کے ذریعے سے ہمارا تزکیہ کرنا چاہتا ہو۔ہمیں تنبیہ کرنا مقصود ہو یا اس کے پیش نظر یہ ہو کہ وہ ان کے ذریعے سے ہمیں آخرت کے خسارے سے بچالے۔

الغرض دنیا میں سب کچھ آزمایش کے لیے اور اس اصول کے مطابق واقع ہوتا ہے جس پر اس کائنات کا نظم ترتیب دیا گیا ہے۔لہٰذا کسی بھی قسم کے ناپسندیدہ حالات میں جزع وفزع اور شکوہ وشکایت کا رویہ اختیار کرنے کا مطلب خدا کی اسکیم پر اعتراض کرنا اور اس کی حکمت اور مشیت کو ناپسندیدہ ٹھیرانا ہے۔یہی چیز ہے جسے روایت میں زمانے کو برا کہنے کو خدا نے اپنے لیے گالی قرار دیا ہے۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو دنیا میں زبان اور عمل دونوں کا امتحان درپیش ہے۔لہٰذا اسے ہر بات کہتے ہوئے اور کوئی بھی کام کرتے ہوئے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی زد کہاں پڑتی ہے۔اسے اللہ کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ ہر حال میں شکر اور صبر کے مقام پر کھڑا ہو۔

______ محمد اسلم نجمی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نماز میں خشوع وخضوع

نماز دین کا بنیادی رکن ہے اور اللہ اور بندے کے تعلق کا سب سے بھرپور مظہر ہے۔اس لیے نماز کی حفاظت اور اس میں خشوع وخضوع کی خواہش بندگی کا لازمی تقاضا ہے۔عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ نماز میں خشوع وخضوع کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک اگر مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رکھی جائیں تو نماز میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

ایک یہ کہ نماز میں اس احساس کے ساتھ کھڑے ہوں کہ ہم اللہ کے حضور میں موجود ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نماز اس طرح پڑھو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔گویا اگر آدمی نماز کے دوران میں خود کو اللہ کی بارگاہ میں تصور کرے تو بندگی اور حضوری کا احساس اس کے رگ وپے میں سرایت کر جائے گا۔جب اس کے اندر یہ شعور بیدار ہوگا کہ وہ اس وقت اس بادشاہ ارض وسما کے سامنے کھڑا ہے جو اس کا خالق و مالک ہے تو اس کی جبین نیاز کے ساتھ

ساتھ اس کا دل بھی بے اختیار جھک جائے گا۔

دوسرے یہ کہ ہر ممکن حد تک نماز باجماعت پڑھی جائے۔ خدا کے ساتھ تعلق کی بیداری کے لیے دربار خداوندی کا ماحول جو کردار ادا کرتا ہے، وہ کئی تقریریں بھی ادا نہیں کرتیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا۔ پھر وہ مسجد کی طرف گیا تو اللہ ہر قدم پر ایک نیکی کا اضافہ کرے گا اور ایک گناہ کم کرے گا۔

تیسرے یہ کہ نماز کے کلمات غور و فکر اور پورے شعور کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ سورۂ فاتحہ اور نماز کے دیگر اذکار میں ایسی مقناطیسیت ہے کہ وہ آدمی کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے نماز میں 'اھدنا الصراط المستقیم' کے الفاظ پر توجہ مرکوز کر کے خشوع و خضوع کو بہتر کیا۔

چوتھے یہ کہ عام زندگی میں اپنی نگاہ کو پاکیزہ رکھا جائے۔ اگر نگاہ میں حیا ہوگی تو آلایشیں نفس کو آلودہ نہیں کر پائیں گے اور انسان پوری توجہ کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف راغب ہو سکے گا۔

پانچویں یہ کہ صالحین کی صحبت اختیار کی جائے اور بری صحبت سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح انسان کی طبیعت نیکی کی طرف مائل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں نماز میں بہتری آتی ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ نماز میں خشوع و خضوع کے لیے فکر مندی خود ایک مثبت چیز ہے۔ بندۂ مومن کبھی اللہ سے اپنے تعلق کی کسی خاص سطح پر مطمئن نہیں رہتا، بلکہ ہمیشہ خدا کے قرب اور اس کی خوشنودی کے حصول کی کوششوں میں مگن رہتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو اٹھ کر اللہ سے استغفار طلب کیا کرتے تھے۔ اسی طرح صحابۂ کرام مثلاً حضرت عمر بھی کبھی کبھی اپنی نمازوں کے بارے میں پریشان ہو جاتے تھے، جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت عمر ان اصحاب میں سے ہیں جو بدر میں شریک ہوئے اور جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کی بشارت دی تھی۔

_____ کاشف علی خان شیروانی

جنت

میں نے بحیثیت انسان شعور سنبھالا تو بعض دوسرے سوالات کی طرح مجھے ان دو سوالوں نے بھی پریشان کیا۔ ایک یہ کہ زندگی کیا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ میرے خالق نے مجھے یہ کیوں عطا کی ہے، اور اسے کیسے بسر کرنا چاہیے؟

پہلے سوال پر جب میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ زندگی آسایش ہی نہیں آزمایش بھی ہے۔ یہ ببول کے کانٹوں کا گھنا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جنگل ہے جسے عبور کرنے والے کو اختتام سفر پر زخموں سے چور چور بدن تحفے میں ملتا ہے۔ یہ ٹھاٹھیں مارتی ہوئی شوریدہ سر لہروں کا بحر ذخار ہے جسے عبور کرنے والا جب اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر ساحل تک پہنچتا ہے تو سانس دم آخر پر ہوتی ہے۔ یہ گہری اور عمیق گھاٹیوں کے مانند ہے جہاں ذرا سی لغزش ہڈیوں کو سرمے میں تبدیل کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ عظیم لوگ زندگی کو آزمایش سمجھ کر یوں سرخ رو گزر جاتے ہیں جیسے کوئی اعتقادِ خداوندی کے سہارے پانی پر پیر رکھ کر پار اتر جائے۔ مگر آں سوے افلاک نے مجھے وقت پیدایش جذبات اور خواہشات عطا کر دیں۔ اور ان میں سب سے شدید خواہش اس لافانی دنیا کا حصول تھی۔ اسی خواہش کے زیر اثر میں نے کبھی بلند و بالا عمارات تعمیر کیں اور کبھی دیو ہیکل مشینیں ایجاد کیں، مگر خواہش پوری ہونے کے لیے پیدا ہی کب ہوتی ہے۔

جب مجھے یہاں بھی اطمینان نصیب نہ ہوا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ کسی گوشۂ عافیت میں پناہ لے لوں؟ کیوں نہ اسی فطرت کی طرف لوٹ جاؤں جہاں رعنائی بھی ہے اور صفائی بھی ہے؟ جہاں دختر دہقان کا گیت ہے، ساربانوں کے نغمے ہیں۔ جہاں پینگوں میں بہار جھولے لیتی ہے۔ جہاں کھیتوں کا سبزہ دل موہ لیتا ہے۔ جہاں رات تارے چھٹکاتی ہے۔ جہاں جھرنے پھوٹتے ہیں، کوئل گاتی ہے، بلبل چہکتی ہے، چاندنی کھلتی ہے اور جہاں خزاں بھی حسن بن کر آتی ہے۔ مگر دل کو اطمینان کہیں بھی نہیں کہ یہاں ہر چیز کتنی بھی خوبصورت پر کشش اور دل آویز بن جائے، رہتی نامکمل ہی ہے۔

بالآخر میرے خالق نے خود میری رہنمائی اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے فرمائی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ خالق کے کام اسی کے لیے رہنے دو۔ تم مخلوق ہو، خالق کے حکم کی پیروی کرو تو ایک مکمل دنیا، جنت کے نام سے اس غفور و رحیم عظیم رب نے تمھارے لیے ہی بنائی ہے۔ اس نے یہ زندگی اس لیے بنائی تاکہ تم میں سے بہترین اپنی جنت کے لیے چن سکے۔ بس تم بھی اس دوڑ میں شامل ہو جاؤ اور اس کی توقع رکھو جو انسانی سوچ سے زیادہ بلند، خیال سے زیادہ خوبصورت اور ذات سے زیادہ مکمل ہے۔

ــــــ معاذ احسن غامدی

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بیاض

— جاوید

یہ عالم نور ہے، پنہاں نہ پیدا　　تہِ دریا ہے گویا روے دریا

میں صحرا سے نکل کر دیکھتا ہوں　　وہی پھر سامنے ہوتا ہے صحرا

نہ محرم ہے، نہ کوئی راز داں ہے　　تری محفل سے جب نکلا ہوں، تنہا

دلِ ناداں، وہ پہلی یاد اب بھی　　اگرچہ ہے، مگر کم کم ہویدا

یہ مے خانہ سلامت ہے تو ساقی　　ادھر بھی ایک دن پہنچے گی صبا

جنوں کیا چیز ہے دنیا میں؟ یارب　　ہوا ہے عقل کو بھی اس کا سودا

کسی کے درپئے آزار ہونا　　نہیں یہ بندۂ مومن کو زیبا

یہاں کوئی اگر دیکھے تو ہر سو　　قیامت ہر نفس رہتی ہے برپا

ندا پھر وادیِ فاراں سے آئی　　ہوئے کیوں اجنبی زیتون و سینا؟

کوئی تیرے مسلماں کو بتائے　　زمانہ دوش ہوتا ہے، نہ فردا

اِدھر اے سارباں، اِس راستے پر

نواحِ کاظمہ، پھر سوے بطحا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org